اسلام کا
نظامِ عشر و زکوٰۃ

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

مکتبۂ نعیمیہ دیوبند

اسلام کا نظامِ عشر و زکوٰۃ

"جس میں اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت اور برکات و فوائد، زکوٰۃ کے اموال اور نصاب و مقدار، اس کی شرائط اور ادائیگی کے طریقے و آداب، اس کے مصارف، زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کے اجتماعی نظام اور زکوٰۃ سے متعلق جدید مسائل نیز صدقۃ الفطر، صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ وغیرہ کے احکام سے متعلق مذاہب اربعہ کی روشنی میں تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اخیر میں عمومی فائدے اور سہولت کیلئے زکوٰۃ کے تمام ضروری احکام مستقل طور پر جمع کر دئے گئے ہیں۔"

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

بہ اہتمام : المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد تعلیم آباد، پہاڑی شریف روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۵
ناشر : کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، ضلع سہارنپور (یو۔پی) ۲۴۷۵۵۴

جملہ حقوق محفوظ

طبع دوم

۱۴۲۲ھ م ۲۰۰۱ء

کتاب : اسلام کا نظام عشر و زکوۃ

مصنف : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

کمپوزنگ : الفاران اردو کمپیوٹر سنٹر (سید عبید اللہ) 4456229-4442771

صفحات : ۲۲۰

قیمت :

بہ اہتمام : المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد تعلیم آباد، پہاڑی شریف روڈ، حیدر آباد ۵۰۰۰۰۵

ناشر : کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، ضلع سہارن پور (یو.پی) ۲۴۷۵۵۴

فہرست مضامین

طبع دوم (مؤلف) ۱۱

پیش لفظ (مولانا مجیب اللہ ندوی) ۱۲

ابتدائیہ (مؤلف) ۱۴

پہلا باب

اسلام میں زکوۃ کی اہمیت ۱۹

- زکوۃ دوسرے مذاہب میں ۲۰
- زکوۃ اور قرآن مجید ۲۱
- زکوۃ اور حدیث نبوی ۲۲
- زکوۃ اور اجماع امت ۲۴
- روحانی اور معاشی اہمیت ۲۵
- کب فرض ہوئی؟ ۲۷
- حقوق زکوۃ کے سواء بھی ہیں ۲۸
- گداگری کی حوصلہ شکنی ۲۸

دوسرا باب

شرائط زکوۃ ۳۳

- مسلمان ہونا ۳۳
- بلوغ ۳۴
- عقل ۳۶
- مال سے متعلق شرطیں ۳۷
- مکمل ملکیت ۳۷

- دیون کی زکوٰۃ ۳۸
- فقہ حنفی کی تفصیلات ۳۹
- نمو پذیر مال ۴۰
- پراویڈنٹ فنڈ میں زکوٰۃ ۴۱
- حاجب اصلیہ سے زائد ہونا ۴۲
- سال کا گذرنا ۴۳
- درمیان سال اضافہ شدہ مال کا حکم ۴۳
- درمیان سال نصاب میں کمی ۴۵
- مدت زکوٰۃ کی اہمیت ۴۵
- کیا دیون زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع ہیں؟ ۴۶
- فقہ حنفی کی تفصیلات ۴۷
- بیوی کا مہر ۴۸
- طویل مدتی قرضہ جات ۴۹

تیسرا باب

اموالِ زکوٰۃ اور نصاب زکوٰۃ ۵۳

- سونا چاندی میں زکوٰۃ ۵۴
- سونے چاندی کا نصاب ۵۴
- علماء کی رائیں ۵۶
- درہم و دینار کے متعلق متفق علیہ اصول ۵۷
- وجہ اختلاف ۵۸
- علماء فرنگی محل وغیرہ کی دلیل ۵۸
- مفتی محمد شفیع وغیرہ کا نقطۂ نظر ۶۹
- خلاصہ بحث ۶۰
- سونا چاندی وغیرہ کا باہم ضم ۶۰
- نصاب پر اضافہ ۶۱
- سونے چاندی میں ملاوٹ ۶۲
- زیورات ۶۳
- زکوٰۃ کی مقدار ۶۴
- نوٹوں پر زکوٰۃ ۶۴
- سامان تجارت میں زکوٰۃ ۶۵
- مال زکوٰۃ کا نصاب ۶۶
- سامان تجارت کب ہوگا؟ ۶۶
- اموال زکوٰۃ کی تجارت ۶۸
- زکوٰۃ بہ صورت سامان یا قیمت؟ ۶۸
- سال گذرنا ۶۹
- باؤنڈز اور شیئرز پر زکوٰۃ ۶۰
- مضاربت میں زکوٰۃ ۶۰
- جانوروں میں زکوٰۃ ۷۱
- کن جانوروں میں زکوٰۃ واجب ہوگی؟ ۷۱
- کس طرح کا جانور وصول کیا جائے؟ ۷۲
- اونٹ کا نصاب اور مقدار ۷۳
- گائے ۷۴
- بکری ۷۴
- گھوڑے ۷۵
- مچھلیاں اور جھینگے ۷۵
- جانوروں کی زکوٰۃ میں اشتراک کا اثر ۷۶
- کمپنی کی زکوٰۃ ۷۷
- معدنیات کی زکوٰۃ ۷۷
- سمندری معدنیات ۷۹
- دفینے ۷۹

- عشر ۸۰
- زکوٰۃ اور عشر کا فرق ۸۰
- کس پیداوار میں عشر ہے؟ ۸۱
- عشر کا نصاب ۸۳
- عشری زمینیں ۸۳
- ہندوستان کی اراضی کا حکم ۸۴
- عشر کی مقدار ۸۸
- عشر کے متفرق ضروری احکام ۸۸
- مقدار زکوٰۃ کی حکمت ۹۰

چوتھا باب

مصارف زکوٰۃ ۹۵

- کیا تمام مصارف میں زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری ہے؟ ۹۶
- فقراء و مساکین ۹۷
- فقر و احتیاج کا معیار ۹۸
- معاشی اعتبار سے تین درجات ۹۹
- کچھ اہم ضروری مسائل ۹۹
- عاملین ۱۰۱
- صاحب نصاب عاملین ۱۰۲
- ہاشمی عاملین ۱۰۲
- عاملین کو کس قدر اجرت دی جائے؟ ۱۰۳
- زکوٰۃ کے حساب و تقسیم کا دوسرا عملہ ۱۰۴
- عاملین اور موجودہ محصلین ۱۰۴
- مؤلفۃ القلوب ۱۰۶
- غلامی کی آزادی ۱۱۰
- غارمین و مقروض ۱۱۰
- فی سبیل اللہ ۱۱۱
- مسافرین ۱۱۳
- استحقاق زکوٰۃ اور فقر ۱۱۴
- مسلمان ہونا ۱۱۴
- بنو ہاشم و سادات ۱۱۵
- کن لوگوں پر زکوٰۃ حرام ہے؟ ۱۱۵
- صدقات نافلہ و صدقات واجبہ ۱۱۵
- نسبی یا ازدواجی قرابت ۱۱۷
- جن مستحقین کو زکوٰۃ دینی بہتر ہے ۱۱۷
- زکوٰۃ کتنی مقدار میں دی جائے؟ ۱۱۸
- تملیک ضروری ہے ۱۲۰
- حیلہ تملیک اور فی زمانہ اس کی اہمیت ۱۲۱

پانچواں باب

زکوٰۃ کا اجتماعی نظام ۱۲۵

- اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ ۱۲۸
- اموال باطنہ کی زکوٰۃ کون وصول کرے؟ ۱۲۹
- امیر کب زکوٰۃ وصول کرے؟ ۱۳۱
- مسلمانانِ ہند کیلئے راہ عمل ۱۳۲
- بیت المال ۱۳۴
- آمد و خرج کے مدات ۱۳۴
- نظام اجتماعی - سراپا رحمت ! ۱۳۵

چھٹا باب

زکوٰۃ کی ادائیگی ۱۳۹

- مال زکوٰۃ ضائع ہو جائے یا کر دے ۱۴۱
- مال زکوٰۃ کا کچھ حصہ ضائع ہو جائے ۱۴۲

- مالک نصاب کی وفات ۱۴۳
- پیشگی زکوٰۃ کی ادائیگی ۱۴۴
- نیت ۱۴۵
- اصل مال یا قیمت کے ذریعہ زکوٰۃ ۱۴۷
- کس وقت کی قیمت معتبر ہوگی؟ ۱۴۸
- زکوٰۃ میں حیلہ ۱۴۸

ساتواں باب

آداب زکوٰۃ ۱۵۳

- من ۱۵۴
- اذیٰ ۱۵۴
- ریاء و نمائش نہ ہو ۱۵۵
- اظہار کے مواقع ۱۵۷
- بہتر مال کا انتخاب ۱۵۸
- حلال و طیب مال ۱۵۹
- بہتر مصرف کا انتخاب ۱۶۰
- ان آداب کا حاصل ۱۶۱

آٹھواں باب

صدقۃ الفطر ۱۶۵

- صدقۃ الفطر کا وجوب ۱۶۶
- ادائیگی کا وقت ۱۶۶
- قرآن و حدیث میں ۱۶۷
- کن لوگوں پر واجب ہے؟ ۱۶۷
- کن لوگوں کا واجب ہے؟ ۱۶۷
- واجب ہونے کا وقت ۱۶۸
- صدقۃ الفطر کی مقدار ۱۶۸
- موجودہ اوزان میں ۱۶۹
- کہاں صَرف کیا جائے؟ ۱۷۰
- مصارف صدقہ ۱۷۱
- چند ضروری مسائل ۱۷۱

نواں باب

صدقات واجبہ ۱۷۵

- کفارۂ قسم ۱۷۶
- قتل کا کفارہ ۱۷۷
- کفارہ ظہار ۱۷۸
- روزہ کا کفارہ ۱۷۹
- روزہ و نماز کا فدیہ ۱۷۹
- نذر ۱۸۱
- جنایات حج ۱۸۱
- قربانی ۱۸۱
- لقطہ ۱۸۲
- صدقات واجبہ کے مصارف ۱۸۲
- اضطراری اور ہنگامی حالات میں مدد ۱۸۳
- ٹیکس کی فقہی اور شرعی حیثیت ۱۸۵

دسواں باب

صدقات نافلہ ۱۸۹

- اعتدال و میانہ روی کی تلقین ۱۹۱
- فقہاء کی تصریحات ۱۹۲
- ماعون ۱۹۳
- کھیتوں اور پھلوں میں سے ۱۹۴
- مہمان کا حق ۱۹۵

- جانوروں میں ۱۹۵
- سوال کرنے والوں کی مدد ۱۹۶
- قربانی ۱۹۷
- عقیقہ ۱۹۷
- ولیمہ ۱۹۸
- انفاق کا احسانی معیار ۱۹۸

گیارھواں باب

زکوۃ وعشر کے ضروری احکام ۲۰۳

- شرائط زکوۃ ۲۰۳
- سال کا گذرنا ۲۰۴
- دین کی منہائی ۲۰۵
- اموال زکوۃ ۲۰۶
- زکوۃ کا نصاب ۲۰۶
- زکوۃ کی مقدار ۲۰۸
- عشر ۲۰۸
- زکوۃ کی ادائیگی ۲۰۹
- زکوۃ کے مصارف ۲۱۱
- زکوۃ کا اجتماعی نظام ۲۱۴
- زکوۃ ادا کرنے کے آداب ۲۱۴
- فہرست مراجع ۲۱۶

طبع دوم

راقم الحروف کی یہ حقیر تالیف بہت کم وقت میں لکھی گئی تھی اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے ساتویں سمینار منعقدہ بھروچ (گجرات) ۲۰ر دسمبر ۱۹۹۴ء تا ۲ر جنوری ۱۹۹۵ء میں اس کی رسم اجراء عمل میں آئی تھی، لیکن بحمد اللہ اسے بڑا قبول حاصل ہوا، اور مختلف حلقوں سے انگریزی اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمہ کی بھی خواہش کی گئی، اس کتاب کے تمام نسخے بہت ہی قلیل عرصہ میں نکل گئے، حقیقت یہ ہے کہ اس کو کئی سال پہلے طبع ہونا چاہئے تھا، لیکن اب کتب خانہ نعیمیہ کی وساطت سے طباعت کی وجہ سے امید ہے کہ یہ برصغیر کے ان حلقوں تک بھی پہنچ سکے گی جہاں ابھی تک نہیں پہنچ پائی ہے۔

اس کا پہلا ایڈیشن مرکز دعوت وتحقیق حیدر آباد سے شائع ہوا تھا اور "المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد" کے قیام کے بعد اب معہد کے زیر اہتمام یہ نیا ایڈیشن طبع ہو رہا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ کتابت کی اغلاط درست ہو جائیں، بعض جگہ حوالہ جات مذکور نہیں تھے، اس ایڈیشن میں ان کی تخریج کر دی گئی ہے، مگر کوئی جوہری تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالی اس کتاب کو لوگوں کے لئے نافع اور اس کوتاہ کار اور بے سواد مؤلف کے لئے زاد آخرت بنادے، وباللہ التوفیق وهو المستعان۔

خالد سیف اللہ رحمانی
(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد)

۲۱ر جمادی الاخری ۲۲ھ
م ۱۰ر ستمبر ۲۰۰۱ء

پیش لفظ

(حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب)

زکوٰۃ کے مستقل موضوع پر اس سے پہلے عربی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں، اس سلسلہ میں سب سے مفصل کتاب ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی "فقہ الزکوٰۃ" ہے جس کا اردو ترجمہ بھی ہوچکا ہے، مگر پھر بھی نئے حالات وواقعات کے پیش نظر اس موضوع پر اب بھی لکھنے کی گنجائش باقی ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اپنی کم عمری کے باوجود وسعت نظری کے ساتھ فقہی جزئیات سے نئے نئے نتائج اخذ کرنے اور اپنے نتائج کو پیش کرنے کا بہترین سلیقہ رکھتے ہیں، قلم میں متانت اور پختگی ہے اور مطالعہ میں عمق اور گہرائی ہے، ان کی متعدد کتابیں اپنے تحقیقی انداز کی وجہ سے بجاطور پر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں اور ہم لوگوں کو عزیز موصوف سے بڑی توقعات ہیں۔

پیش نظر کتاب بھی ان کی فقہی دقت نظر اور تصنیفی صلاحیت کی اچھی مثال ہے۔

مسائل کے سلسلہ میں بنیادی طور پر انہوں نے فقہ حنفی کو سامنے رکھا ہے مگر اہم مسائل میں ائمہ ثلاثہ کی رائیں بھی نقل کردی ہیں، زکوٰۃ کی اہمیت شرائط زکوٰۃ، اموال زکوٰۃ اور نصاب زکوٰۃ، زکوٰۃ کے مصارف، زکوٰۃ کا اجتماعی نظام، زکوٰۃ کی ادائیگی کے احکام اور زکوٰۃ ادا کرنے کے آداب کے علاوہ **صدقۃ الفطر**، صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ کے احکام پر بھی مستقل ابواب قائم کئے گئے ہیں، **چونکہ** ان ابواب میں جابجا فقہاء کے اختلافات، دلائل اور وجوہ ترجیح کا بھی ذکر آگیا ہے، اس لئے مصنف نے کتاب کے آخر میں عامۃ الناس کی سہولت کیلئے سہل اور آسان زبان میں فقہ حنفی کے مطابق مفتی بہ اقوال کی رعایت کرتے ہوئے "زکوٰۃ وعشر کے ضروری احکام" مستقل طور پر جمع کردئے ہیں، اس طرح یہ کتاب بہ یک وقت علماء اور عوام، خواص اور کم پڑھے لکھے لوگ دونوں طبقہ کے لئے قابل استفادہ ہوگئی ہے۔

کتاب کی ترتیب، قدیم مسائل کی توضیح، جدید مسائل کی تحقیق، احکام کے احاطہ و استیعاب، انداز بیان کی خوبی، غرض ہر لحاظ سے کتاب لائق مطالعہ اور قابل استفادہ ہے، خاص طور پر آداب زکوٰۃ کے باب کے تحت زکوٰۃ کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے، اسی طرح اموال باطنہ کی زکوٰۃ اور طویل الاجل دیون کی وجہ سے زکوٰۃ ساقط ہونے کے سلسلہ میں بھی اچھی بحث کی ہے، جن مسائل میں علماء کی رائیں مختلف ہیں، ان میں وجہ ترجیح کی طرف بھی اشارہ کردیا ہے، اور نقاط نظر کے اختلاف کو بھی بڑے توازن اور اعتدال کے ساتھ پیش کیا ہے، واقعہ ہے کہ اس کتاب سے اردو زبان کے ذخیرہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیز گرامی سے بیش از بیش دین اور علم کی خدمت لے اور ان کی یہ کتاب عنداللہ اور عندالناس مقبول ہو۔ آمین

خادم

مجیب اللہ ندوی

(جامعۃ الرشاد، رشاد نگر، اعظم گڈھ)

۵/شعبان ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۰/۲/۱۹۹۲ء

ابتدائیہ

اسلام کے تمام احکام اور ہدایات کا خلاصہ دو باتیں ہیں، خدا کی بندگی اور بندگان خدا کی مدد، نماز خدا کے سامنے غلامانہ احترام بجالانا ہے، روزہ نفس کی خواہش پر خدا کے حکم کو غالب رکھنے سے عبارت ہے، حج خدا کی شان محبوبیت کا اظہار اور بندوں کے اپنے آقا سے وارفتگی کا نشان ہے ـــــ دوسری طرف صدقات اللہ کے بندوں کی مدد اور خلق خدا کی اعانت ہے اور دین کے اس شعبہ کا سب سے جلی اور اہم عنوان "زکوٰۃ" ہے یہ اپنے مال میں خدا اور اس کے بندوں کے حق کا اعتراف ہے اور نماز کے بعد غالباً سب سے اہم رکن اسلام ہے کہ قرآن میں اکثر مواقع پر نماز کے ساتھ ہی زکوٰۃ کا ذکر ہے۔

اسلام کی معاشی تعلیمات میں مثبت پہلو کا عنوان زکوٰۃ کا وجوب ہے اور منفی پہلو کی اساس سود کی حرمت ہے، افسوس کہ خلافت اسلامی اور زکوٰۃ کی جمع وتقسیم کے نظام اجتماعی سے محرومی نے اس فریضہ کی اہمیت کا احساس بھی دلوں سے رخصت کردیا، اس وقت مسلمان اہل ثروت کا ایک قابل لحاظ طبقہ تو اپنی بے دینی کی وجہ سے زکوٰۃ ادا ہی نہیں کرتا ہے اور جو لوگ ادا کرتے ہیں وہ بھی باضابطہ نہیں کرتے، رمضان المبارک کے موقعہ سے علی الحساب کچھ دیدیتے ہیں، اس کی بڑی وجہ لاعلمی اور ناواقفیت بھی ہے، اس لئے عرصہ سے خیال تھا کہ "قاموس الفقہ" کی تکمیل کے بعد اس موضوع پر کچھ لکھنا ہے مگر بعض ایسے محرکات پیش آئے کہ پہلے ہی اس کے لئے قلم اٹھانا پڑا، ایک سوا سال قبل اخی فی اللہ محترم ڈاکٹر منظور عالم صاحب (وفقہ اللہ لما یحب ویرضی) سے گفتگو کے دوران زکوٰۃ کا موضوع زیر بحث آگیا، موصوف نے اس موضوع پر ایک جامع کتاب کی ضرورت کا اظہار کیا، میں نے بھی اس سے اتفاق کیا اور وعدہ کیا کہ انشاء اللہ اس پر لکھنے کی کوشش کروں گا، میں نے اس کو محض ایک رواداری کی بات سمجھی مگر وہ بڑے ثابت قدم ثابت ہوئے اور کئی ملاقاتوں میں یاد دہانی کراتے رہے بالآخر ارادہ کرلیا کہ اس کام کو جلد ہی کر گذرنا چاہئے، اس درمیان اسلامک فقہ اکاڈمی کے چوتھے فقہی سمینار منعقدہ دارالعلوم سبیل السلام حیدر آباد میں آئندہ سمینار کے لئے زکوٰۃ ہی سے متعلق نئے مسائل کو موضوع بحث قرار دیا گیا، اس سے مزید تحریک ہوئی۔

چنانچہ ۲۳؍ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ، ۴؍ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو ۸؍ بجے شب کتاب کی ابتدائی چند سطریں اللہ کا نام لے کر لکھا، ہفتہ عشرہ دوسرے کاموں میں مشغول رہا اور ربیع الثانی میں یہ کام شروع کرسکا، درمیان میں مختلف اسفار کا سلسلہ بھی رہا اور اسباق کا دباؤ بھی، خدا خدا کرکے آج کہ ۲۰؍ جمادی الثانیہ ہے، یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ رہا ہے، واللہ ہو الموفق والمستعان۔

اس کتاب کے اصل ابواب سات ہیں جو زکوٰۃ کی اہمیت، زکوٰۃ وعشر کے احکام، زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کے اجتماعی نظام اور زکوٰۃ ادا کرنے کے آداب وغیرہ سے متعلق ہیں، ضمنی طور پر صدقۃ الفطر، صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ کی ضروری بحثیں بھی تین مستقل ابواب میں کی گئی ہیں، ان ابواب میں کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ درپیش مسائل جمع کردئے جائیں، اہم مسائل میں فقہاء کے اختلاف پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اختصار کے ساتھ دلائل بھی بیان کردئے گئے ہیں، جدید مسائل کو خصوصیت سے حل کیا گیا ہے، دلائل اور اختلاف کے ذکر کی وجہ سے مناسب سمجھا گیا کہ عام کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ان بحثوں کو چھوڑ کر مجرد اصل مسائل ایک جگہ لکھ دئے جائیں کہ یہ فقہی اختلاف کی وجہ سے پریشان خاطر نہ ہوں اور اپنی عملی زندگی کے لئے صحیح حکم جان لیں، چنانچہ ایک آخری باب خاص اسی مقصد کے لئے لکھا گیا ہے، اس طرح کل گیارہ ابواب پر یہ کتاب مشتمل ہے، کوشش کی گئی ہے کہ تمام ضروری مسائل اس میں آجائیں۔

حوالہ جات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، کوشش بھر زبان کو سہل وآسان رکھنے کی سعی کی گئی ہے مجرد فقہی بحث کی بجائے ترغیب وترہیب کی آیات وروایات نقل کی گئی ہیں اور احکام شرعیہ کی مصلحتوں، حکمتوں اور افادی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس کو دل آسانی سے قبول کرتا ہے اور پڑھنے میں اکتاہٹ بھی نہیں ہوتی ہے۔

اس کتاب میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کا اندازہ خود حوالہ جات سے ہو

جائیگا لیکن اس سلسلہ میں حضرت مولانا عبد الصمد رحمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی "کتاب العشر والزکوۃ" کا خصوصیت سے ذکر کرنا چاہتا ہوں، مولانا موصوف کے پیش نظر اصل میں زکوۃ کے اجتماعی نظام سے بحث کرنا ہے اور کتاب کا زیادہ تر حصہ اسی کے لئے وقت ہے، واقعہ ہے کہ اس موضوع پر یہ ایک نہایت اہم تحریر ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزاء .

اس موقع سے خصوصیت سے عزیز گرامی مولانا اشرف علی قاسمی سلمہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ کتاب کے بہت سے حصے کو املاء کراتا رہا اور عزیز موصوف نے تحریر و تبییض کے ذریعہ میری مشکل آسان کردی، بعض جگہ حوالہ جات کی تخریج میں بھی عزیز موصوف اور مولوی کمال الدین قاسمی سلمہ (تخصص فی الفقہ) نے مدد کی، سادات و بنی ہاشم کی زکوۃ کے مسئلہ پر "جدید فقہی مسائل دوم" میں راقم سطور نے ایک گونہ تفصیل سے بحث کی تھی، اس کتاب میں چاہتا تھا کہ اس کا خلاصہ شامل کردیا جائے، یہ تلخیص کا کام عزیزی مولوی حبیب الرحمٰن قاسمی سلمہ (تخصص فی الفقہ) نے انجام دیا، اللہ تعالیٰ ان تمام عزیزوں کو بہتر اجر اور اپنے دین کے علم کا بہترین حصہ ... فرمائے۔

خالد سیف اللہ رحمانی

بیت العلم، کوتہ پیٹ، حیدر آباد

۲ر جمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ

اسلام کا نظام عشر و زکوۃ

باب : ۱

اسلام میں زکوۃ کی اہمیت

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت

اسلام بعض دوسرے مروجہ مذاہب کی طرح محض کچھ رسوم و رواج اور عبادات کے مخصوص طریقوں کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک دین ہے، (آل عمران-۱۹) ایک مکمل نظام حیات اور دستور زندگی، جو زندگی کے ایک ایک مسئلہ میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے، کھانا، پینا، سونا، جاگنا، کسب معاش، ازدواجی زندگی، عبادات و معاملات، ملک و قوم کی فرماں روائی، عدل و انصاف، جنگ و امن، خلوت و جلوت، شخصی تعلقات، بین قومی روابط، غم کے لمحات، خوشی کی ساعتیں، کوئی مرحلہ اور کوئی مسئلہ نہیں جس میں انسانیت کو راستہ نہ بتایا گیا ہو —— اس دنیا میں جہاں انسان کا خدا سے بندگی اور عبدیت کا رشتہ ہے وہ عبد ہے، اور خدا معبود، وہ بندہ و غلام ہے اور خدا مالک و آقا، وہ مجبور ہے اور خدا قادر مطلق، وہ سراپا احتیاج ہے اور خدا کامل غنی اور حاجت سے بالاتر، وہیں دوسری مخلوقات اور بالخصوص دوسرے انسانوں سے بھی اس کا ایک تعلق ہے۔ یہ تعلق ہم سائیگی کا ہے، برادری اور بھائی چارے کا ہے، محبت و انس کا ہے، اور ایک دوسرے کے کام آنے کا ہے، اسلام نے خدا سے رشتہ بندگی کے استوار کرنے کو مقصود بنایا ہے اور خلق خدا سے حسن سلوک کو خدا سے قربت کے لیے ذریعہ قرار دیا ہے۔

اسلام کے تمام احکام کی روح یہی ہے کہ ان کا مقصود خدا کی بندگی ہے یا انسان کی خدمت، پہلی قسم کے احکام حقوق اللہ کہلاتے ہیں اور دوسری قسم کے احکام حقوق الناس، قرآن مجید نے اکثر مواقع پر اللہ کے حقوق کے ساتھ بندوں کے حقوق بھی ذکر کیے ہیں۔ توحید کے ساتھ والدین سے بہتر سلوک کا حکم فرمایا گیا ہے۔ ان لاتعبدوا الا اياه وبالوالدين احسانا (بنی اسرائیل-۲۳) کہیں نماز کے ساتھ قربانی کا ذکر آیا، فصل لربك وانحر (کوثر-۲) اور

بیشتر مقامات پر جہاں نماز کی تاکید کی گئی ہے، وہیں زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت بھی فرمائی گئی ہے، اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ (مزمل-٢٠) —— بلکہ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے انسان کی خدمت کو خدا کی عبادت کا درجہ دیا ہے۔ کفارۂ ظہار ساٹھ روزے رکھنا ہے لیکن روزہ نہ رکھ سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے (مجادلہ-٣) کفارۂ قسم میں بھی روزے نہ رکھ سکے تو مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑے پہنائے (مائدہ-٨٩) رسول اللہ ﷺ نے رمضان المبارک کے روزوں میں جان بوجھ کر بیوی سے صحبت کر لینے پر ساٹھ روزے یا اس کی جگہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا کفارہ قرار دیا، ان کفارات سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ غریبوں کی مدد اور بندگانِ خدا کی خدمت روزہ جیسی عبادت کے ہم پلہ اور ہم درجہ ہے، دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ترازو میں اس کی خاص تاثیر یہ ہے کہ اس کے ذریعہ گناہ معاف ہوتے ہیں اور یہ خطاؤں کے لیے کفارہ بن جاتے ہیں —— پس حقوق اللہ کا سب سے عظیم الشان رکن "نماز" ہے اور حقوق الناس کا سرنامہ "زکوٰۃ" ہے۔

زکوٰۃ —— دوسرے مذاہب میں!

انسانی معاشرے میں کچھ لوگوں کا دولت مند اور کچھ کا غریب و ضرورت مند ہونا نظامِ قدرت اور تقاضۂ فطرت ہے، اس لیے ہر سماج کی ضرورت ہے کہ اس کے خوش حال اور اصحابِ کشائش اپنے ضرورت مند اور غریب بھائیوں کی مدد اور ان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے اپنی دولت کا کچھ حصہ اسی مقصد کے لیے نکالیں، اسی لیے پہلے آسمانی مذاہب میں بھی زکوٰۃ و صدقات کا حکم فرمایا گیا۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ حضرت اسماعیل بھی اپنے اہل و عیال کو زکوٰۃ دینے کا حکم فرمایا کرتے تھے کان یامر اھلہ بالصلوٰۃ والزکوٰۃ (مریم-٥٥) بنی اسرائیل سے خدا نے جن باتوں کا عہد لیا تھا ان میں نماز کا قائم کرنا اور زکوٰۃ کا ادا کرنا بھی تھا (بقرہ-٣) حضرت مسیح نے بھی اعلان فرمایا کہ مجھے زندگی بھر اقامت صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کی ہدایت کی گئی ہے واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیا۔ (مریم-٣١)

ہر چند کہ بائبل میں انسانی ہاتھوں اور دماغوں نے بہت کچھ تحریف کی ہے، لیکن اب بھی اس میں کہیں مبہم اور کہیں واضح ہدایت صدقہ و انفاق کی ملتی ہیں، تورات غلہ اور جانور دونوں میں دسواں حصہ واجب قرار دیتا ہے۔

اور زمین کی پیداوار کی مساوی دہ یکی (١) خواہ وہ زمین کے بیج کی یا درخت کے پھل کی ہو، خداوند کی ہے اور خداوند کے لیے پاک ہے —— اور گائے بیل اور بھیڑ بکری یا جو جانور چرواہے کی لاٹھی کے نیچے سے گذرتا ہو، ان کی دہ یکی یعنی دس پیچھے ایک ایک جانور خداوند کے لیے پاک ٹھہرے۔

(احبار ٢٧-٣٠-٣٢)

فی کس آدھا مثقال اس کے علاوہ ہے، حضرت موسیٰ کو جو ہدایات دی گئیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ۔

دولت مند نیم مثقال سے زیادہ نہ دے اور نہ غریب اس سے کم دے۔

(خروج ٣٠: ١٥)

دوسرے مذاہب میں بھی نذر، قربانی اور دان کا تصور موجود ہے۔ غرض انسانی خدمت غریبوں کی مدد اور حاجت مندوں کی حاجت بر آئی مذاہب عالم اور انسانی فطرت سلیمہ کا ایک مشترک ورثہ ہے جسے اسلام نے نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کو خدا کی بندگی کا اہم درجہ بنادیا اور اس کی اہمیت میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کو اس کا ایک مرتب نظام عطا فرمایا۔

زکوٰۃ اور قرآن مجید

اسلامی تعلیمات کا اولین اور مستند ترین سرچشمہ قرآن مجید ہے، قرآن مجید نے زکوٰۃ کو جو اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے بیس مقامات پر زکوٰۃ کو اسلام کے رکن اول نماز کے دوش بدوش ذکر کیا ہے۔ بتیس مقامات پر صریحاً زکوٰۃ کا اور پندرہ مقامات پر صدقہ کا ذکر آیا ہے۔ مختلف سیاق میں رحمت خداوندی کا حق دار ہونے کے لیے ایمان و تقویٰ کے ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی کو بھی شرط قرار دیا گیا (اعراف-١٥٦) اور فرمایا گیا کہ زکوٰۃ تمہارے مال میں کمی کا سبب نہیں بلکہ برکت و اضافہ کا باعث ہے۔ وما آتیتم من زکوٰۃ تریدون وجہ اللہ فاولئک ھم المضعفون (روم-٣٩) آخرت میں اس کا جو ثواب ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع

---

(١) دہ یکی کے معنی دسواں حصہ ہے

سنابل فی کل سنبلة مأة حبة ، واللہ یضاعف لمن یشاء واللہ واسع علیم. (بقرہ-۲۶۱)

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کی مثال اس بوئے گئے دانے کی ہے جس میں سات بالیاں نکل آئیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں، اللہ جس کے لیے چاہتے ہیں دوچند کردیتے ہیں اور وہ وسعت والے اور علم والے ہیں۔

یہ بھی فرمایا گیا کہ نماز اور زکوٰۃ آخرت میں غم وافسوس اور خوف واندیشہ سے حفاظت کرے گی۔(بقرہ-۲۷۷)

جو لوگ زکوٰۃ ادا نہ کریں اور غریبوں کے اس حق سے پہلو تہی برتیں ان کے لیے اسی درجہ عبرت ناک سزا ہے :

یوم یحمی علیها فی نارجهنم فتکوی بها جباههم وجنوبهم وظهورهم هذا ماکنزتم لانفسکم فذوقوا ماکنتم تکنزون

(توبہ-۳۵)

جس دن سونا چاندی دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے پیشانیاں، پہلو اور پشت داغے جائیں گے (اور کہا جائے گا کہ) یہی مال ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، اب اس مال کا مزا چکھو۔

کہیں فرمایا گیا کہ اس مال کا طوق عذاب بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا (آل عمران-۱۸۰) واقعہ ہے کہ اعمالِ صالحہ میں نماز کے بعد جس تاکید واہتمام اور کثرت وتکرار کے ساتھ قرآن مجید نے زکوٰۃ وصدقات، انفاق، انسان کی مدد، یتیموں اور حاجت مندوں کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر کیا ہے، کسی اور عمل پر اس اہمیت کے ساتھ زور نہیں دیا گیا ہے۔

زکوٰۃ اور حدیث

رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ کو ارکانِ اسلام میں نماز کے بعد درجہ دیا ہے اور بعض اوقات آپ ﷺ نے جن باتوں پر بیعت لی ان میں زکوٰۃ کا بھی ذکر فرمادیا(۱) آخرت میں زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر آپ ﷺ کی جو وعیدیں ہیں، وہ نہایت لرزا دینے والی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ

(۱) بخاری ،کتاب الزکوٰۃ ۱/۱۸۸

جس مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہوگی، وہ زہریلے سانپ کی صورت اختیار کرکے گلے کا طوق بن جائے گا اور ڈستا رہے گا(۱) ـــــ جن جانوروں کی زکوٰۃ نہ دی گئی ہوگی وہ اس کے جسم کو روندیں گے ،(۲) دو خواتین خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، جن کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کی زکوٰۃ ادا کردی ہے؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا : کیا تم کو یہ پسند ہے کہ آگ کے کنگن تم کو پہنائے جائیں؟ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت فرمائی۔(۳)

اس کے علاوہ آپ ﷺ نے دنیا میں بھی زکوٰۃ ادا کرنے پر خوش خبری اور نہ ادا کرنے پر اللہ کی پکڑ کا ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا کہ صدقہ سوء خاتمہ سے بچاتا ہے،(۴) عمر میں اضافہ کرتا ہے (۵) ستر مصیبتوں کے دروازے بند کرتا ہے ،(۶) بلائیں صدقہ کی وجہ سے نہیں آتی ہیں فان البلاء لایتخطاها، (۷) جس مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے، تو مالِ زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ اصل مال بھی ہلاک وضائع ہوجاتا ہے ،(۸) جو قوم زکوٰۃ ادا نہیں کرتی، اس پر اللہ کی طرف سے قحط کا عذاب آتا ہے ،(۹) دنیا میں انسان کی بداعمالیوں کا اس پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ حضرت ابن عمرؓ نے اس سلسلے میں حضور ﷺ کی اثر انگیز روایت نقل کی ہے، فرماتے ہیں :

> رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا : اے جماعت مہاجرین! پانچ گناہ ہیں کہ جب تم ان میں مبتلا ہوگے، (مصیبتوں میں پڑوگے) اور میں اس بات سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں کہ تم ان گناہوں میں مبتلا ہو جس قوم میں کھلے عام بدکاریاں ہونے لگیں ان میں طاعون اور ایسی تکلیف دہ بیماریاں پیدا ہوں گی جو پہلے کے لوگوں کو نہیں ہوئی ہوں گی، ناپ تول میں کمی کریں گے تو قحط، تنگ حالی اور حکمرانوں کا جور وظلم ان پر ہوگا، جو زکوٰۃ ادا نہ کریں گے بارش سے محروم کردیے جائیں گے اور (اس بستی میں) جانور نہ ہوں تو

(۱) بخاری ، باب اثم مانع الزکوٰۃ (۲) حوالہ سابق

(۳) ترمذی عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جدہ ۱/۱۳۸ باب ماجاء فی زکوٰۃ الحلی

(۴) ترمذی عن انس ۱/۱۴۴ باب ماجاء فی فضل الصدقة (۵) الترغیب والترهیب ۱۶۱

(۶) حوالہ سابق

(۷) مشکوٰۃ المصابیح ، باب الانفاق الخ بحوالہ رزین عن علی ۱/۱۶۷ الفصل الثالث

(۸) مشکوٰۃ ،کتاب الزکوٰۃ (۹) الترغیب والترهیب

شاید ان پر بالکل ہی بارش نہ ہو، خدا اور رسول کے پیمان کو توڑیں گے تو دشمنوں کو جو کفار ہوں گے ان پر مسلط کردے گا اور وہ ان کے قبضہ سے بعض چیزیں چھین لیں گے اور مسلمانوں کے جو حکمراں قرآن مجید کے مطابق فیصلہ نہ کریں گے اور احکام الٰہی کو ترجیح نہ دیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی قوت کو باہم ہی ٹکرادے گا۔(۱)

غور کیا جائے تو آج اس حدیث کی تصدیق چشم سر سے دیکھی جاسکتی ہے، اقوام مغرب میں بدکاریاں، ایسے امراض کا وجود کہ جن سے کان و دل یکسر نا آشنا تھے، حکمرانوں کا ظلم و جور، قحط و خشک سالی، مسلمانوں پر ان کے دشمنوں کا غلبہ و تسلط اور باہم آویزشیں، یہ ساری حقیقتیں دوپہر کی دھوپ کی طرح سامنے ہیں!ـــــ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی تنگ حالی اور درماندگی کا ایک اہم سبب اس امت کا فریضہ زکوٰۃ سے غفلت و بے اعتنائی ہے۔

زکوٰۃ اور اجماع امت

قرآن و حدیث کی انھیں تاکیدات اور تصریحات کے پیش نظر فقہاء اور سلف صالحین کا زکوٰۃ کے فرض ہونے پر اجماع و اتفاق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد جب بعض لوگوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا، حضرت ابو بکرؓ نے ان سے جہاد کا ارادہ فرمایا، ابتداً حضرت عمرؓ کو ان لوگوں کے خلاف فوجی کاروائی کرنے میں تامل تھا، لیکن پھر ان کو بھی شرح صدر ہو گیا،(۲) حضرت ابو بکرؓ نے ان کے خلاف جہاد فرمایا اور کسی نے اختلاف نہیں کیا اس طرح اس پر صحابہ کا اجماع و اتفاق ہو گیا۔

بعد کو فقہاء نے بھی اس پر اجماع نقل کیا ہے حافظ ابن رشد کا بیان ہے :

فاما معرفة وجوبها فمعلوم من الكتاب والسنة والاجماع فلا خلاف فی ذالك. (۳)

اس کا وجوب کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

(۱) ابن ماجه عن ابن عمر باب العقوبات ۲/۲۹۰ (۲) بخاری ۱/۱۸۸، باب وجوب الزكوة
(۳) بدايته المجتهد ۱/۲۴۴ ، كتاب الزكوة

فقہا کے اختلاف پر مشہور کتاب "رحمۃ الامۃ" میں ہے :

اجمعو علی ان الزكوة احد اركان الاسلام . (۱)

فقہا کا اتفاق ہے کہ زکوٰۃ ارکان اسلام میں سے ایک ہے

نیز علاء ابن منذر نیشاپوری نے بھی اونٹ، گائے، بکری اور سونا، چاندی میں زکوٰۃ واجب ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔(۲)

اس طرح زکوٰۃ کی فرضیت اور دین کے ایک عظیم رکن ہونے کی حیثیت سے اس کی اہمیت قرآن و حدیث، صحابہ کے عمل اور امت کے اجماع و اتفاق سے ثابت ہے !

روحانی اور معاشی اہمیت

غور کیجئے تو مذاہب کی تعلیم کا خلاصہ اللہ سے تعلق اور محبت ہے، راہبوں کی رہبانیت اور گھٹنے کے بل قیام، مندروں میں بتوں کے سامنے سجود و نیاز، آتش کدوں میں آتش اعتقاد کو سلگانا اور مسلسل روشن رکھنا، ان سب کا خلاصہ اپنے خیال و عقیدے کے مطابق خدا سے تعلق کے اظہار کے سوا اور کیا ہے؟ اسلام نے اس مقصد کے لیے نماز کا نہایت پاکیزہ اور اثرانگیز عمل رکھا جس میں زبان اور آنکھیں ہاتھ اور پاؤں اور جسم کا ایک ایک حصہ خدا کی بارگاہ میں حاضر اور متوجہ رہتا ہے عجز و فروتنی کی انتہا یہ ہے کہ انسان اپنی پیشانی تک خاک پر رکھ دیتا ہے۔

لیکن تعلق مع اللہ اسی وقت اوج کمال کو پہنچ سکتا ہے، جب کہ غیر اللہ سے بے تعلقی کا اظہار ہو، دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ دامن نفس کو کھینچتی اور اپنا فریفتہ کرتی ہے وہ مال و دولت ہے، اس کی حرص اول خدا سے بے توجہ کرتی ہے، پھر دولت و ثروت کا نشہ دل و دماغ پر چڑھتا ہے اور کبر و غرور انگڑائیاں لینے لگتا ہے، یہی "کبر" دین و اخلاق کے لیے سم قاتل ہے اس سے خود غرضی پیدا ہوتی ہے، ایثار کا جذبہ مفقود ہوتا ہے۔ لوگوں کے حقوق کو وہ ڈھکوسلہ سمجھنے لگتا ہے، اپنی دولت ـ کے لیے خود اپنے قوت بازو کا ثمر ہونے کا خیال جڑ پکڑتا ہے۔

"زکوٰۃ" اسی مال کی محبت کو کم کرتا ہے "نماز" خدا سے تعلق کا سامان تھا اور "زکوٰۃ" غیر اللہ سے بے تعلقی کا عنوان ہے، اسی کو "تزکیہ" کہا جاتا ہے، اس سے تواضع کا اظہار ہوتا ہے، ایثار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، زکوٰۃ کا عمل بندہ کے اس یقین کو ظاہر کرتا ہے کہ جو کچھ ہے، خدا کا

(۱) رحمه الامته ۹۳ ، كتاب الزكوة (۲) ملاحظہ ہو : الاجماع ۳۶-۳۸

عطیہ ہے، اس میں خود اس کی قوت وقدرت کو دخل نہیں، یہ اس بات کا اقرار ہے کہ خدا کی خوشنودی کی قربان گاہ پر وہ دولت دنیا کو قربان کرنے کے لیے تیار ہے، یہ ایمان کی تازگی ہے، دولت دنیا کی تطہیر ہے، عقیدہ اور باطن کی صفائی ہے اور اعمال کی پاکی ہے، اسی لیے اس کا نام ہی "زکوٰۃ" رکھا گیا، جس کے معنی ہی پاکی کے ہیں، قرآن نے زکوٰۃ میں پائی جانے والی تربیت اخلاق اور تزکیہ باطن کی خاص صلاحیت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

خذ من اموالهم صدقة تطهرهم . (توبہ-۱۰۳)

آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے اس کے ذریعہ آپ انھیں پاک و صاف کردیں گے۔

یہ تو زکوٰۃ کا اخلاقی اور روحانی پہلو ہے ـــــ اس کے مادی اور معاشی فوائد ظاہر ہیں، کوئی بھی سماج دولت منداور غریب طبقہ سے خالی نہیں ہو سکتا۔ زکوٰۃ سماج کے غریب طبقہ کو تحفظ و ضمانت عطا کرتا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے خوب فرمایا ہے کہ اگر تمام لوگ زکوٰۃ ادا کریں تو کسی کو غذا اور لباس سے محروم ہونا نہ پڑے:

ان الله فرض على الاغنياء فى اموالهم بقدر مايكفى فقرائهم وان جاعوا وعروا وجهدو فمنع الاغنياء وحق على الله ان يحاسبهم يوم القيمة ويعذبهم عليه . (۱)

اللہ نے اہلِ دولت پر جو زکوٰۃ فرض کی ہے وہ اتنی مقدار ہے کہ فقراء کے لیے کافی ہو جائے اگر یہ بھوکے، بے لباس اور پریشان رہیں تو یہ اغنیاء کے فریضہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی وجہ سے ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ وہ قیامت کے دن ان کا محاسبہ کریں اور ان کو اس پر عذاب دیں۔

یقیں ہے کہ اگر دولت کے اعتبار سے تین درجات کیے جائیں، ایک وہ لوگ جن پر زکوٰۃ واجب ہے، دوسرے وہ جو زکوٰۃ کے حقدار ہیں، پھر ان لوگوں کی دولت اور اس کی شرح زکوٰۃ کا حساب کیا جائے جن پر زکوٰۃ واجب ہے، اور ان لوگوں کی غربت کو ملحوظ رکھ کر ان کی ضروریات کا حساب لگایا جائے، تو ضرور زکوٰۃ تمام غرباء کی ضرورت کو پوری کردے گی۔ کاش اعداد شمار کی مدد سے اس کی تحقیق کی جائے تو انشاء اللہ آپ ﷺ کی یہ پیش گوئی ایمان و عقیدت کی آنکھوں سے

(۱) کنز العمال ۳/۳۰۰

نہیں بلکہ سر کی آنکھوں سے دیکھی جاسکے گی۔ وصلی اللہ علیہ وسلم

"زکوٰۃ" کی ادائیگی کا خود اہلِ ثروت کو یہ فائدہ ہوگا کہ غرباء طبقہ ـــــ جس کی محنت اور جفاکشی ہی ہر چراغ عیش میں شعلہ زن ہے اور جن کے دم سے ہی عشرت کدہ حیات کی ساری بہار قائم ہے ـــــ میں ان کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا نہیں ہوں گے اور وہ ان کو اپنا ہمدرد و بہی خواہ سمجھیں گے، مغربی سرمایہ داری میں زکوٰۃ کے لیے تو کیا جگہ ہوتی؟ سود نے غرباء اور مزدوروں کی کمر توڑ رکھی ہے، یہ سود اس محتاج و محنت کش طبقہ میں اہلِ دولت کے خلاف مخالف جذبات کو جنم دیتا ہے اور بھڑکاتا ہے، کمیونسٹ تحریک اسی رد عمل میں پیدا ہوئی۔

کب فرض ہوئی؟

زکوٰۃ کی جو روحانی اور معاشی اہمیت ہے اس کے تحت اسلام کے اوائل میں جو فرائض مسلمانوں پر عائد کیے گئے، ان میں زکوٰۃ بھی ہے۔ چنانچہ مکی سورتوں میں بھی زکوٰۃ کا ذکر موجود ہے، حضرت جعفرؓ نے نبوت کے پانچویں سال حبش کو ہجرت کی ہے، اور وہاں نجاشی کے دربار میں پیغمبر اسلام ﷺ کی جن تعلیمات کا ذکر کیا ان میں زکوٰۃ بھی ہے، اسی سے ابن خزیمہ نے ثابت کیا ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت ہجرت سے پہلے ہوئی ـــــ البتہ احکام زکوٰۃ کی تکمیل مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد ہوئی اور ۹ھ میں آپ ﷺ نے عمال کو زکوٰۃ کی وصولی کے لیے روانہ فرمایا، گویا فرضیت زکوٰۃ مکہ میں ہوئی اور زکوٰۃ کا نفاذ مدینہ میں ہوا، وہیں احکام زکوٰۃ کے قواعد وضوابط مقرر کیے گئے، نصاب مقرر ہوا، مقدار بتائی گئی، مصارف متعین کیے گئے اور وصولی زکوٰۃ کے لیے عمال کا تقرر ہوا اور جمع و تقسیم کا پورا نظام مرتب ہوا۔

حافظ ابن حجر نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ زکوٰۃ دو مرحلوں سے گذری ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت جعفرؓ نے اپنے خطاب میں جس زکوٰۃ کا ذکر کیا تھا، اس سے مقررہ نصاب اور حولان حول کی شرط والی زکوٰۃ مراد نہیں ہے (۱) اسی طرح آیت قرآنی جس میں سونے چاندی کی ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ہے، اس کے بارے میں راوی کا بیان ہے کہ یہ حکم نزول زکوٰۃ سے پہلے کا ہے، ابن حجر کا بیان ہے کہ اصل زکوٰۃ کا حکم اس آیت سے پہلے ہی نازل ہو چکا تھا، یہاں نزول زکوٰۃ سے زکوٰۃ کے نصاب اور احکام کا نازل ہونا مراد ہے، (۲) غرض مکہ میں زکوٰۃ فرض

(۱) فتح الباری ۳/۳۴۰ (۲) فتح الباری ۳/۳۴۸

ہوئی اور مدینہ میں احکام زکوٰۃ کی تکمیل عمل میں آئی۔

حقوق ــــ زکوٰۃ کے سوا بھی ہیں!

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اسلام میں انفاق کا حکم زکوٰۃ ہی تک محدود ہے، بلکہ انفاق کا درجہ کمال تو یہ ہے کہ انسان اپنی ضرورت کے بعد جو کچھ بچ رہے، صدقہ کردے، قرآن مجید نے اس کو "عفو" کہا ہے (بقرہ-۲۷) لیکن اگر اتنا حوصلہ نہ پاتا ہو اور ایمان کی کمزوری اس کی اجازت نہ دیتی ہو تو کم سے کم اتنا تو ہر مسلمان کو سمجھنا چاہیے کہ زکوٰۃ کے سوا اور حقوق بھی اس کے مال میں ہیں -چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا : ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ (۱) محروم اور سائلوں کا بھی اس کے مال میں حق ہے (معارج ۱) اس سلسلے میں حضرت عائشہؓ کی ایک روایت بے ساختہ قلم پر آیا چاہتی ہے، ایک بکری ذبح کی گئی، اور گوشت تقسیم کردیا گیا، آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے دریافت فرمایا : کیا بچ رہا، انھوں نے عرض کیا : سارا تقسیم ہو گیا صرف ایک شانہ بچ رہا، آپ ﷺ نے فرمایا : بلکہ سب بچ رہا سوائے اس شانہ کے بقی کلھا الا کتفھا (۲) یعنی جو تقسیم ہوا، وہی تو آخرت کے لیے محفوظ اور بچا ہوا ہے ــــ آگے "صدقات واجبہ" اور "صدقات نافلہ" کی اقسام اور احکام کی بحثیں آئیں گی، ان سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں انفاق کی اور کیا کیا متعین اور غیر متعین مدات ہیں اور اسلام میں انفاق کی کیا اہمیت ہے؟

گداگری کی حوصلہ شکنی

زکوٰۃ کے احکام، معاش اور کسب معاش کے سلسلہ میں اسلام کے نقطہ نظر کو واضح کرتے ہیں ــــ اسلام کا تصور ہے کہ مال بجائے خود کوئی مذموم اور ناپسندیدہ چیز نہیں، قرآن مجید نے "مال" کو "خیر" (بھلی چیز) سے تعبیر کیا ہے (صف-۱۱) کہیں اس کو فضل (رحمت خداوندی) کہا ہے (جمعہ-۱۰) بہت سی نیکیاں ہیں کہ مال کے بغیر نہیں کی جاسکتیں، بہت سی عبادتیں ہیں کہ مال ہی کے ذریعہ انجام پاتی ہیں اور انسانی حقوق تو اکثر وہ ہیں کہ مال ہی سے متعلق ہیں۔ دولت اگر دولت مند کو خدا اور اس کے دین سے غافل نہ کرے، ان کی دولت ابوبکرؓ و عثمانؓ اور عبدالرحمن بن عوفؓ کی طرح کلمۃ اللہ کی سربلندی اور پسے ہوئے ستم رسیدہ

(۱) ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب ماجاء ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ (۲) ترمذی

اور مظلوم لوگوں کے مدد کے لیے صرف ہو، تو اس دولت مندی پر فقر و درویشی نچھاور ہو، قرآن نے جس دولت کی مذمت کی ہے وہ یہ کہ مال داری اور دولت مندی انسان کو خدا سے غافل کردے (تکاثر-۱) اور بخل و تنگی اس کے ہاتھ کو باندھ رکھے (محمد-۲) نیز جو کسب معاش میں حلال و حرام کا امتیاز باقی نہ رکھے اور کسب دولت کے لیے وہ راہیں اختیار کرے جو خدا کو ناراض کرنے والی ہیں، ان طریقوں کو قرآن باطل طریقہ پر مال حاصل کرنا قرار دیتا ہے لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل . (بقرہ-۱۸۸)

اسی لیے اسلام نے حاجت مندوں اور سائلوں کی مدد کی ترغیب دی ہے لیکن گداگری اور دریوزہ گری کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی ہے، آپ ﷺ نے زکوٰۃ کو مال کا میل قرار دیا ہے (۱) اس طرح ایک طرف زکوٰۃ لینے والے کو تنبیہ کی کہ شدید مجبوری اور ضرورت کے درجہ کو پہنچے بغیر زکوٰۃ نہ لیں ــــ دوسری طرف زکوٰۃ ادا کرنے والوں کو تعلیم دی کہ جس طرح جسم اور کپڑوں کے میل صاف کرکے انسان خوش ہوتا ہے نہ کہ کبیدہ، اسی طرح مال کا یہ میل دور کرکے خوش ہونا چاہیے، کوئی تکدر محسوس نہ کرنا چاہیے، ایک روایت میں ہے کہ جس نے مال کی کثرت کے لیے سوال کیا، وہ دراصل انگارۂ دوزخ کا طالب ہے، اب جس کا دل چاہے تھوڑے انگارے لے اور جس کا جی چاہے زیادہ، (۲) آپ ﷺ نے فرمایا کہ سوال ایک زخم ہے جس سے انسان اپنے چہرہ (آبرو) کو مجروح کرتا ہے، (۳) حضرت ابوہریرہؓ آپ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ یہ بات کہ تم لکڑی اپنی پشت پر اٹھا کر لاؤ (فروخت کرو) اس سے کچھ صدقہ کرو اور لوگوں کے سامنے دست سوال پھیلانے سے بچو، سوال شکرنے سے بہتر ہے، کہ اونچا یعنی دینے والا ہاتھ نیچے یعنی لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے، (۴) ایک صاحب سوال لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، تو آپ ﷺ نے یہی تدبیر فرمائی، ان کے پاس صرف ایک ٹاٹ اور قعب تھا، وہ منگایا، یہ دونوں چیزیں دو درہم میں فروخت ہوئیں اس میں ایک درہم آپ ﷺ نے ان کو ان کی فوری ضرورت کے لیے دیا اور ایک درہم سے کلہاڑی بنا کر حوالہ کی کہ اس سے لکڑی کاٹ کرلائیں اور فروخت کرکے اپنی ضروریات پوری کریں۔ (۵)

(۱) مجمع الزوائد ۳/۹۱ عن ابن عباس، باب الصدقة الوسول الله الخ
(۲) مسلم عن ابی ھریرہ ۱/۳۳۳، باب النھی عن المسئلہ
(۳) ترمذی، عن سمرہ، باب ماجاء فی النھی عن المسئلہ (۴) حوالہ سابق
(۵) ابن ماجہ عن انس بن مالک ۱/۱۵۸ باب بیع المزایدہ

سوال کی عادت انسان کو عزت نفس کے احساس سے محروم کر دیتی ہے، آدمی بے حجاب بن جاتا ہے اور وہ شرافت و آدمیت کے ایک بہت بڑے جوہر سے محروم ہو جاتا ہے، اسلام کی ان متوازن تعلیمات کو دیکھیے اور ان بھکشوؤں، سنیاسیوں اور راہبوں کو دیکھیے جو کسبِ معاش کو خدا سے قربت اور نزدیکی میں رکاوٹ سمجھتے ہیں اور در در ٹھوکریں کھانے، دستِ سوال پھیلانے اور غیرت و خودداری، عزتِ نفس اور حیاء و ضمیر کی موت کو دین داری باور کرتے ہے ـــــ اسلام ضرورت مندوں کو ضرور دوسروں کی طرف اپنی حاجت پیش کرنے کی اجازت دیتا ہے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ غیرت و خودداری کے جوہر سے بھی انسان خالی نہ ہو، اس کو ایک مذموم اور ناپسندیدہ عمل تصور کرے اور اضطرار و مجبوری ہی کی حالت میں کسی کے سامنے سوال کی زبان کھولے۔(۱)

۞۞۞۞۞۞

(۵) کب اور کن حالات میں سوال درست ہے؟ اس کے لیے ملاحظہ ہو : "فقر و احتیاج کے درجات"

اسلام کا نظام عشر و زکوٰۃ

باب : ۲

شرائط زکوٰۃ

شرائط زکوۃ

دوسری عبادات کی طرح زکوۃ کے فرض ہونے کے لیے بھی شریعت نے کچھ شرطیں مقرر کی ہیں، ان شرطوں میں بنیادی طور پر دو باتیں ملحوظ ہیں، ایک یسر و سہولت اور حرج و تنگی سے گریز، کہ اگر ہر مال میں زکوۃ واجب قرار دیدی جاتی، بنیادی ضروریات کی چیزوں کا بھی استثناء نہ ہوتا، مال میں افزائش اور نمو کے لیے ایک مدت کی مہلت نہ دی گئی ہوتی تو اس سے اصحابِ سرمایہ کو زحمت ہوتی۔ دوسرے اس بات کی رعایت کہ انسان شریعت کے احکام کا مخاطب اور مکلف بھی بن سکتا ہو، ایک شخص عقل سے محرومی کی وجہ سے ابھی شریعت کے احکام کا مخاطب ہی نہ ہو، اور اس پر زکوۃ واجب قرار دی جائے تو یہ منصفانہ بات نہ ہوگی یا وہ ابھی دامنِ اسلام میں آیا ہی نہ ہو اور اس کو زکوۃ کی ادائیگی کا پابند کیا جائے تو یہ مذہبی جبر ہوگا، اسلام ایسی جبر و نا انصافی کی باتوں سے ماوراء ہے۔

یہ شرطیں بنیادی طور پر دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو اس شخص سے متعلق ہیں جس پر زکوۃ واجب ہوتی ہے اور دوسرے خود اس مال سے متعلق جن کی زکوۃ ادا کرنی ہوتی ہے۔

۱ - مسلمان ہونا :

زکوۃ ادا کرنے والے شخص سے متعلق پہلی شرط اس کا مسلمان ہونا ہے، اسلام کا نقطہ نظریہ ہے کہ جن لوگوں کو ابھی ایمان کی توفیق ہی میسر نہیں ہوئی ہے اور ابھی وہ اسلام کے

دائرہ سعادت میں داخل ہی نہیں ہیں، وہ شریعت کے تفصیلی احکام کے مخاطب نہیں ہیں (۱) اس لیے کہ اگر ان کو احکام و تفصیلات کا بھی پابند کیا جائے تو یہ مذہبی جبر اور دوسروں کے مذہبی معاملات میں مداخلت ہوگی، جو روا نہیں، خود قرآن مجید ناطق ہے : **لا اکراہ فی الدین .**

(بقرہ : ٢٥٦)

چنانچہ فقہا کا اتفاق ہے کہ کافر پر زکوٰۃ واجب نہیں، اس لیے اگر کوئی کافر اسلام قبول کرے تو زمانہ کفر کی زکوٰۃ، ادا کرنا اس پر لازم نہیں (۲) البتہ اختلاف اس صورت میں ہے کہ اگر خدانخواستہ کوئی مرتد ہو جائے اور ایک عرصہ کے بعد دوبارہ توبہ کرلے اور مسلمان ہو جائے تو کیا ایسی صورت میں زمانہ ارتداد کی زکوٰۃ اسے ادا کرنی ہوگی ؟ احناف اور عام فقہا کے نزدیک واجب نہیں (۳) شوافع کے یہاں قول مشہور کے مطابق واجب ہے۔ (۴)

۲ - بلوغ

دوسری شرط اس کا بالغ ہونا ہے، نابالغوں کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، یہ رائے احناف کی ہے (۵) شوافع اور حنابلہ کے نزدیک نابالغوں کے مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اس کی طرف سے اس کا ولی زکوٰۃ ادا کرے گا (۶) شوافع وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے یتیموں کے مال میں تجارت کا حکم دیا کہ زکوٰۃ اسے کھا نہ جائے، اگر یہ روایت اپنے ذریعہ ثبوت کے اعتبار سے صحیح اور قوی ہوتی تو اس مسئلہ میں دلیل قاطع کا درجہ رکھتی مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے خود امام نوویؒ کو اعتراف ہے کہ **هذا الحديث ضعيف** (۷) حنفیہ کے نقطۂ نظر کی تائید میں بھی بعض صحابہ کے آثار ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول تو خود امام ابو حنیفہؒ کے واسطے سے منقول ہے کہ یتیم کے مال میں

(۱) دنیا میں کفار احکام شریعت کے مخاطب نہیں ہیں، اس پر اتفاق ہے، آخرت کے اعتبار سے مخاطب ہیں یا نہیں ؟ اور آخرت میں ان کو صرف ایمان سے محرومی ہی پر عذاب ہوگا یا احکام شریعت نہ بجالانے پر بھی، اس میں اختلاف ہے، شوافع کے نزدیک حکم اخروی کے لحاظ سے وہ ان احکام کے مخاطب ہیں، حنفیہ کے نزدیک اس لحاظ سے بھی مخاطب نہیں۔
بدائع ۴/۲، شرح مہذب ۳۲۸/۵

(۲) لاتجب على الكافر الاصلى حتى لايخاطب بالاداء بعد الاسلام . بدائع الصنائع ۴/۲

(۳) بدائع الصنائع ۴/۲ (۴) شرح مہذب ۳۲۸/۵ (۵) هدایه مع الفتح ۱۱۵/۲

(۶) المغنی ۲۵۶/۵ (۷) شرح مہذب ۳۲۹/۵

زکوٰۃ نہیں **لیس فی مال الیتیم زکوٰۃ** (۱) مگر خود یہ اثر بھی بے داغ نہیں، اول تو خود ابن مسعودؓ کا جو مذہب منقول ہے وہ یہ کہ نابالغی کی حالت میں اس کے مال سے زکوٰۃ ادا تو نہ کی جائے گی لیکن واجب ہوگی، بالغ ہونے کے بعد جب اس کا مال اس کے سپرد کر دیا جائے تو اس کو سمجھا دیا جائے کہ اس قدر زمانہ نابالغی کی زکوٰۃ تمہارے ذمہ ہے (۲) دوسرے امام ابوحنیفہؒ نے یہ روایت لیث بن ابی سلیم سے نقل کی ہے جن کے بارے میں بیہقی جیسے امام جرح و تعدیل کا خیال ہے کہ اہل علم نے ان کو ضعیف شمار کیا ہے **ضعف اهل العلم ليثاً .** (۳)

اس لیے حق یہ ہے کہ خود اس مسئلہ پر کوئی صریح اور صحیح روایت موجود نہیں، شوافع کے پیش نظر یہ ہے کہ زکوٰۃ کا مقصد غرباء کی مدد ہے اور مالی معاملات میں نابالغ پر بھی شریعت کے احکام جاری ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بیوی کا نفقہ اور تاوان مالی اس پر بھی عاید ہوتا ہے (۴) احناف کے پیش نظر یہ ہے کہ زکوٰۃ ایک مالی عبادت ہے اور شریعت نے نابالغوں پر عبادت واجب قرار نہیں دی ہے، عبادت وہ عمل ہے جو ارادہ و اختیار سے انجام دی جائے اور ظاہر ہے کہ نابالغ کی زکوٰۃ جب ولی ادا کرے گا تو خود اس شخص کے ارادہ و اختیار کا کوئی تعلق اس سے نہیں رہے گا۔ (۵)

واقعہ ہے کہ مختلف قرائن ہیں جو احناف کے مسلک کو تقویت پہنچاتے ہیں :

اول : یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے جن امور پر بیعت لی اور جن کو اسلام کی بنیاد قرار دیا، ان میں توحید و رسالت کے اقرار، نماز، روزہ اور حج کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا نام بھی لیا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ زکوٰۃ بھی دوسری عبادات کی طرح ایک عبادت ہی ہے اور نابالغوں کے حق میں اس کا بھی وہی حکم ہونا چاہیے جو دوسری عبادتوں کا ہے۔

دوم : زکوٰۃ کے بارے میں قرآن نے کہا ہے۔

خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها . (توبہ ۱۰۳)

ان کے مال سے زکوٰۃ وصول کیجیے تاکہ آپ ان کو پاک کریں اور اس کے ذریعہ ان کا تزکیہ فرمائیں۔

(۱) کتاب الآثار لمحمدؒ ۴۶ (۲) المغنی ۲۵۶/۲

(۳) شرح مہذب ۳۲۹/۵ (۴) شرح مہذب ۳۲۹/۵

(۵) ہندیہ ۱۷۲/۱

یہاں زکوٰۃ کو گناہوں سے تطہیر وتزکیہ کا باعث قرار دیا گیا ہے اور نابالغ کہ احکام شرعیہ کا مکلف نہیں، کی تطہیر ناقابلِ تصور ہے۔

تیسرے : حج بھی ایک مالی عبادت ہے اور یہ بالاتفاق نابالغوں پر واجب نہیں۔

چوتھے : ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ تین اشخاص سے قلم اٹھالیا گیا ہے، سوتا ہوا شخص تا آنکہ بیدار ہو جائے، بچہ تا آنکہ بالغ ہو جائے اور پاگل یہاں تک کہ صحت مند ہو جائے (۱) یہ حدیث جہاں نابالغوں کو نماز اور دوسری شرعی تکلیفات سے بری کرتی ہے، زکوٰۃ کے حکم سے بھی اس کے مستثنیٰ ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔

اس لیے صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ نابالغوں کے مال میں زکوٰۃ واجب نہ ہو گی۔

۳ ۔ عقل

ٹھیک یہی اختلاف جو اوپر مذکور ہوا ہے، ایسے شخص کے مال کے بارے میں بھی ہے جس کا دماغی توازن درست نہ ہو، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک پاگل کے مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہے (۲) اور اس کا ولی زکوٰۃ ادا کرے گا، احناف کے ہاں چوں کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور ایسا شخص عبادات کا مکلف نہیں اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہو گی (۳) ـــــ احناف کے مسلک کی تفصیل یہ ہے کہ کوئی شخص دائمی جنون میں مبتلا ہو تو چاہے وہ کبھی بھی نصاب زکوٰۃ کا مالک ہوا ہو لیکن جس وقت صحت یاب ہوا ہو اس وقت سے ایک سال گذرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہو گی اور اگر عارضی جنون ہو یعنی جنون کا دورہ پڑتا رہتا ہو، کبھی افاقہ کی کیفیت رہتی ہو اور کبھی جنون کی، تو مالکِ نصاب ہونے کے وقت جنون کی حالت میں ہو لیکن ایک سال کے اندر اس پر کوئی وقفہ بھی صحت کا آجائے تو زکوٰۃ واجب ہو گی۔ (۴)

بے ہوش ہونے کے بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ بے ہوش پر زکوٰۃ واجب ہو گی۔ چاہے پورا سال بھی وہ اسی حالت میں رہے۔ (۵)

---

(۱) المغنی ۲/۲۵۶ — (۲) المغنی ۲/۲۵۶

(۳) ھدایہ مع الفتح ۲/۲۱۵ — (۴) ھندیہ ۱/۳۷۹

(۵) حوالۂ سابق

مال سے متعلق شرطیں

زکوٰۃ واجب ہونے سے متعلق کچھ شرطیں وہ ہیں جن کا تعلق خود "مال" سے ہے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ شریعت نے ہر مال میں زکوٰۃ واجب نہیں کی ہے اور نہ ہر تھوڑی زیادہ مقدار میں، بلکہ مخصوص نوعیت کے مال اور اس کی ایک خاص مقدار میں ہی زکوٰۃ رکھی گئی ہے۔ یہ کون سے اموال ہیں اور کم سے کم کس مقدار میں زکوٰۃ واجب ہو گی؟ اس کی تفصیل "اموال و نصابِ زکوٰۃ" کے تحت ذکر کی جائے گی۔

اس کے علاوہ اور شرطیں بھی ہیں : مالک کو اس مال پر مکمل ملکیت حاصل ہو، نصابِ زکوٰۃ کا مالک ہونے کے بعد بھی اس پر ایک سال گذر چکا ہو اور اس مال میں نشوونما اور بڑھوتری بھی ہوتی ہو۔

مکمل ملکیت

"ملکیت تامہ" سے کیا مراد ہے؟ فتاویٰ تاتار خانیہ میں اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:

ان یکون ملکه ثابتا من جمیع الوجوه لایتمکن النقصان فیه بوجه. (۱)

اس کی ملکیت مکمل طور پر ثابت ہو اور اس میں کسی طرح کا نقص نہ پایا جاتا ہو۔

علامہ ابن ہمام نے "ملکیت تامہ" ایسی کیفیت کو قرار دیا ہے کہ مالک اس مال پر ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہو کمال الملك بكونه مطلقا للتصرف (۲) ملک العلماء علامہ کاسانی نے اس کو پوری طرح واضح اور بے غبار کر دیا ہے کہ جب دو باتیں جمع ہو جائیں تو کسی مال پر ملکیت تامہ (مکمل ملکیت) سمجھی جائے گی، اول یہ کہ وہ اس کا مالک ہو، دوسرے وہ مال اس کے قبضے میں بھی ہو ان یکون مملوکا له رقبة ویدا (۳) قرض پر حاصل شدہ رقم میں زکوٰۃ واجب نہیں اس کا بدل واجب الادا ہے اس طرح گویا قرض کا وہ مالک ہی نہیں ہے۔ مہر پر جب تک قبضہ نہ کر لے زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی کہ گو عورت اس کی مالک ہے مگر قبضہ مفقود ہے (۴) زیور یا کوئی چیز

---

(۱) تاتار خانیہ ۲/۲۱۷ — (۲) فتح القدیر ۲/۱۱۳

(۳) بدائع الصنائع ۲/۹ — (۴) حوالۂ سابق

بھی ہے جو "دَین" لینے یا اس کے باقی رہنے سے انکار کرتا ہو اور صاحب حق کے پاس ضروری ثبوت موجود نہ ہو۔(۱)

پہلی اور دوسری صورت میں گو زکوٰۃ "دَین" کی وصولی کے بعد ہی واجب ہوتی ہے لیکن دونوں صورتوں میں فقہا نے فرق یہ کیا ہے کہ "دَین قوی" میں نصاب زکوٰۃ کے پانچویں حصہ کی وصولی کے بعد اور "دَین وسط" میں پورے ایک نصاب زکوٰۃ یعنی موجودہ اوزان میں ساڑھے باون تولہ چاندی کے مساوی قیمت وغیرہ کے حاصل ہونے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی(۲) مگر یہ حکم ازراہِ سہولت ہے ورنہ بہتر یہی ہوگا کہ جتنی رقم ملتی جائے اس کی زکوٰۃ ادا کرتا جائے، اسی طرح کسی کا "دَین" مقدار نصاب سے کم ہی ہو اور اس کے پاس موجود اموالِ زکوٰۃ کو ملا کر نصاب پورا ہوتا ہو، تو جتنی رقم باقی ہو اس رقم کے وصول ہونے کے بعد اس کی زکوٰۃ ادا کرے، اگر کوئی شخص دَین کی وصولی سے پہلے ہی زکوٰۃ ادا کرلے تاکہ حسابات کی حفاظت کی دقت اور یک بارگی کئی سال کی زکوٰۃ کی گرانباری سے بچ سکے تو یہ بھی درست ہے۔

"دَین ضعیف" پر قبضہ کے بعد سال گذر جائے پھر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی گذرے ہوئے ایام کی جن میں دَین پر اصل مالک کا قبضہ نہیں تھا- کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی(۳) امام ابو یوسفؒ و محمدؒ کے نزدیک اس صورت میں گذرے ہوئے ایام کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔(۴)

مال نامی

شریعت نے زکوٰۃ انہی اموال پر واجب قرار دی ہے جو اپنی موجودہ حالت میں اس لائق ہوں کہ ان کے ذریعے معاشی بڑھوتری ہوسکتی ہو، مال تجارت اور عوامی چراگاہوں سے چارہ حاصل کرنے والے جانوروں پر زکوٰۃ عائد کی گئی، سونا اور چاندی جس کی تخلیق ہی گردشِ دولت

---

(۱) تاتارخانیہ ۲/۳۰۴، فتح القدیر ۲/۱۲۴

(۲) امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت کے مطابق "دَین وسط" پر گذرے ہوئے دنوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور کرخی نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ حسن بن زیاد کی روایت کے مطابق جو حکم "دَین قوی" کا ہے وہی "وسط" کا ہے۔ اور دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ امام محمدؒ سے منقول ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے اور قاضی خاں اور اکثر اہل علم نے اسی کو ترجیح دیا ہے
فتاویٰ تاتارخانیہ ۲/۲۹۹-۳۰۰

(۳) بدائع الصنائع ۲/۱۰ (۴) حوالہ سابق

کے لئے ہے، ان میں زکوٰۃ کا حکم رکھا گیا اور ان کے مقابلے میں سواری اور دوسرے کاموں کے لیے جو جانور ہوں، ان میں زکوٰۃ نہیں رکھی گئی، ادنیٰ غور و تامل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان احکام میں شریعت نے اسی نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے۔

چنانچہ علامہ کاسانی نے وجوب زکوٰۃ کے لیے، مال کے نامی یعنی ایسا مال جس میں اضافہ کی صلاحیت ہو، ہونے کی مستقل شرط رکھی ہے:

ومنها كون المال ناميا وانما نعنى به كون المال معد اللا ستنماء بالتجارة أو بالاسامة لان الاسامة سبب لحصول الدر والنسل والسمن والتجارة سبب لحصول الربح.(۱)

ان شرطوں میں سے ایک مال نامی ہونا ہے یعنی مال اس لائق ہو کہ اس میں تجارت یا پرورش کے ذریعہ اضافہ ہوسکے، اس لئے کہ (مویشیوں کی) پرورش نسل اور دودھ نیز گھی کے حصول کا ذریعہ ہے، اور تجارت نفع کے حصول کا۔

پراویڈنٹ فنڈ میں زکوٰۃ

"پراویڈنٹ فنڈ کی رقم حکومت جبراً کاٹ لیتی ہے" یہ دَین قوی کے زمرہ میں تو آ نہیں سکتی کہ یہ سامان تجارت کے عوض نہیں اور زکوٰۃ ہونے کی اصل وجہ سامان تجارت کا قائم مقام ہونا ہے ـــــ لیکن فقہاء کی عبارتیں اس سلسلے میں مضطرب اور مختلف ہیں کہ اجرت کا دَین وسط میں شامل ہے یا دَین ضعیف میں؟ فقہاء نے دونوں طرح کے اقوال نقل کیے ہیں جن کا علامہ سرخسی نے تذکرہ کیا ہے(۲) اور خود دَین وسط کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ گذرے ہوئے دنوں کی زکوٰۃ اس دَین پر واجب ہوگی یا نہیں؟ کرخی اور کاسانی وغیرہ نے زکوٰۃ واجب نہ ہونے کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے(۳) زکوٰۃ واجب ہونے کی اصل ہے مال تجارت ہونا چوں کہ بدل اصل کے حکم میں ہوتا ہے، اسی لیے فقہاء نے سامان تجارت کے دَین کو سامان تجارت کے حکم میں رکھا ہے، یہ بات اس صورت میں مفقود ہے، دوسرے مال زکوٰۃ کے سلسلے میں شریعت کا یہ مزاج

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۱۱ (۲) المبسوط ۲/۱۹۵

(۳) بدائع الصنائع ۲/۱۰

ہے کہ وہ افزائش پزیر مال (مال نامی) ہی میں واجب ہوتی ہے، یہ بھی اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ اس مال میں زکوٰۃ واجب نہ ہو کیوں کہ قبضہ مفقود ہونے کی وجہ سے اس رقم میں کوئی افزائش اور کوئی نمو متوقع نہیں۔

لہٰذا پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قبضہ کے بعد بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، یہی رائے مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی ہے (۱) ـــــــ ہاں چوں کہ بعض فقہاء کے نزدیک ہر طرح کے دَین میں زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے، اس لیے اختلاف سے بچنے کے لیے زکوٰۃ ادا کر دینے میں احتیاط ہے!

حاجتِ اصلیہ سے زائد ہونا

اسی شرط سے زکوٰۃ کے واجب ہونے کے لیے ایک اور شرط معلوم ہوئی اور وہ ہے مال زکوٰۃ کا حاجت اصلیہ سے زائد ہونا۔ ضروری اور استعمالی مال، نصاب زکوٰۃ میں شمار نہیں کیا جائے گا اور اس کو مستثنیٰ کر کے ہی زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی اس حاجتِ اصلیہ میں رہائشی مکانات، استعمالی کپڑے، گھر کے سامان، سواری کے جانور، اپنی حفاظت کے ہتھیار (۲) زیبائش و آرائش کے سامان، ہیرے جواہرات، یاقوت، قیمتی برتن، وغیرہ داخل ہیں (۳) ـــــــ مگر یہ سب اس وقت ہے جب کہ ان کی تجارت نہ کی جائے، اگر ان اشیاء کی تجارت کرتا ہو تو پھر مال تجارت ہونے کی وجہ سے ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

کاریگروں کے صنعتی آلات، مشینوں اور اشیاء کے سلسلے میں یہ تفصیل ہے کہ ایسی چیزیں جو بعینہٖ اپنا وجود کھوتی نہیں ہیں، جیسے پریس کی مشینیں یا معمولی سطح پر کلہاڑیاں وغیرہ، یا ان کا جو اس طرح ختم ہو جاتا ہے کہ ان کا اثر بھی باقی نہیں رہتا، جیسے صابن، کہ کپڑے دھونے کے بعد ان کا وجود باقی نہیں رہتا اور نہ کپڑے میں اس کا وجود باقی رہتا ہے، ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، ایسی چیزیں کہ گو اپنا وجود باقی نہیں رکھ پاتیں مگر دوسری اشیاء میں اپنا اثر باقی رکھتی ہیں، وہ مال تجارت کے حکم میں ہیں اور اگر ان پر سال گذر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اس کی مثال "رنگ" ہے جو گو کپڑے وغیرہ رنگنے کے بعد اپنا وجود کھو دیتا ہے مگر رنگین اشیاء میں ان کا اثر باقی رہتا ہے۔ (۴)

---

(۱) امداد الفتاویٰ ۲/۴۸ (۲) ہندیہ ۱/۱۷۲

(۳) ہدایہ مع الفتح ۲/۱۱۹ (۴) فتح القدیر ۲/۱۳۰- ہندیہ ۱/۱۳۰

مطالعاتی کتابیں بھی "حاجتِ اصلیہ" میں داخل ہیں ان میں وہ تمام کتابیں داخل ہیں جو تدریس، حفظ یا تصحیح کی غرض سے جمع ہوں، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام و عقیدہ اور اصول فقہ کی کتابیں تو "حاجتِ اصلیہ" میں داخل ہیں ہی، ادب، طب وغیرہ کی کتابیں بھی اسی زمرہ میں ہوں گی، ایک نسخہ سے زیادہ بھی حاجتِ اصلیہ میں داخل ہے (۱) ہاں، اگر یہ کتابیں تجارتی اغراض کے لیے ہوں تو پھر مال تجارت ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

سال کا گذرنا

ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ کسی مال میں اس وقت تک زکوٰۃ نہیں، جب تک کہ اس پر سال نہ گذر جائے (۲) حضرت علیؓ سے بھی اسی مضمون کی روایت منقول ہے، اس میں تمام اموال زکوٰۃ کی بجائے صرف چاندی اور سونے کا ذکر ہے (۳) ان دونوں روایات اور پیغمبر اسلام اور آپ ﷺ کے خلفاء کے عہد کے معمولات کو سامنے رکھ کر فقہاء نے اموال زکوٰۃ میں سال گذرنے (حولان حول) کی شرط رکھی ہے اور بعض میں نہیں۔ علامہ ابن قدامہؒ نے اس کا خلاصہ یوں تحریر کیا ہے کہ اموال زکوٰۃ پانچ ہیں۔ حیوانات، اثمان یعنی سونا، چاندی، سامان تجارت، بالاتفاق ان اموال میں نصاب زکوٰۃ کا مالک ہونے کے بعد سال گذرنا بھی ضروری ہے، چوتھے کھیتیاں اور پھل، پانچویں معدنیات، ان دونوں پر سال گذرنے کی قید نہیں، پیداوار حاصل ہوتے ہی عشر (دسواں حصہ) اور معدنیات نکلتے ہی خمس (پانچواں حصہ) واجب ہوگا۔ (۴)

البتہ فقہاء کے درمیان دو نکات پر اختلاف ہے، ایک اس پر کہ اگر سال کے درمیان نصاب زکوٰۃ میں اضافہ ہو جائے تو کیا اس پر بھی سال گذرنے کے بعد ہی زکوٰۃ واجب ہوگی؟ دوسرے اگر درمیانِ سال مقدارِ نصاب میں کمی ہو جائے تو زکوٰۃ کے حکم پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

درمیان سال اضافہ شدہ مال کا حکم

پہلے مسئلہ پر علامہ کاسائی نے بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے کہ:

الف: نصابِ زکوٰۃ جس جنس کے مال کا ہو، اگر دوسری جنس کا مال درمیان سال حاصل ہو

---

(۱) فتح القدیر ۲/۱۲۰ (۲) ابن ماجہ

(۳) ابوداؤد ۱/۲۲۸ (۴) المغنی ۲/۲۵۷

جیسے اُونٹ تعداد میں بحدِ نصاب تھے، سال کے درمیان چند بکریوں کا اضافہ ہو گیا تو بالاتفاق بکریوں کے اس اضافہ پر پہلے سے موجود اُونٹوں کے نصاب کے ساتھ مل کر زکوٰۃ واجب نہ ہو گی۔

ب : اگر اضافہ شدہ مال نہ صرف اصل نصاب کی جنس سے ہو بلکہ اسی سے یا اسی کے ذریعہ حاصل ہوا ہو، تو اتفاق ہے کہ اس پر سال کا گذرنا ضروری نہیں، اصل نصاب پر جب سال مکمل ہو جائے تو اس کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ ادا کرے گا، جیسے گائے کا نصاب تھا، درمیان سال اس کے بچے ہوئے تو ان بچوں پر علاحدہ سے سال گذرنا ضروری نہیں، اسی طرح سامانِ تجارت پر دورانِ سال جو نفع حاصل ہوا ان منافع پر علاحدہ سے ایک سال کا گذرنا ضروری نہیں، بلکہ اصل سامانِ تجارت پر جب سال گذر جائے تو اس مال پر حاصل شدہ منافع کی بھی زکوٰۃ واجب ہو گی۔

ج : اضافہ شدہ مال اصل نصاب کی جنس سے ہو لیکن کسی مستقل ذریعہ سے حاصل ہوا ہو، مثلاً گائیں بحدِ نصاب تھیں اور درمیان سال کسی نے مزید کچھ گائیں ہبہ کر دیں تو ان اضافہ شدہ گایوں پر بھی سال گذرنا ضروری ہو گا، یا گائے کے سابقہ نصاب پر سال گذرنے کے ساتھ ان گایوں کی زکوٰۃ بھی ادا کی جائے گی؟ ـــــ اس میں اختلاف ہے، احناف کے نزدیک اس "اضافہ" پر سال کا گذرنا ضروری نہیں، وہ اصل نصاب کے تابع ہے، شوافع کے نزدیک اس پر بھی سال گذرنا ضروری ہے(۱) یہی رائے عام فقہاء کی بھی ہے(۲) ان حضرات کے پیش نظر یہ روایت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا : اضافہ شدہ مال میں زکوٰۃ نہیں، جب تک اس پر سال نہ گذر جائے۔(۳)

علاوہ اس کے کہ اس روایت کی صحت اہلِ علم کے نزدیک مسلّم نہیں اور محققین نے اس کو ابن عمرؓ کا فتویٰ مانا ہے نہ کہ ارشاد نبوی ﷺ، احناف اس حدیث کا مصداق اوپر ذکر کی گئی تین صورتوں میں سے دوسری کو قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اضافہ شدہ اصل نصاب ہی کی جنس سے ہے، اس لیے اس کی حیثیت اس کے تابع کی ہے اور اصل پر سال کا گذرنا اس کے لیے بھی کافی ہے۔

(۱) بدائع الصنائع ۲/۱۳، نیز دیکھئے : شرح مہذب ۵/۳۶۴
(۲) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۷۴۷ (۳) موقوف علی ابن عمر، نصب الرایہ ۲/۳۳۰

درمیان سال نصاب میں کمی

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ نصاب زکوٰۃ مکمل ہوا، اور درمیانِ سال نصاب سے کم مقدار باقی رہ گیا مگر انتہاءِ سال پر پھر نصاب پورا ہو گیا، تو درمیان میں مقدارِ نصاب میں ہونے والی کمی کی وجہ سے دوبارہ نصاب مکمل ہونے پر از سر نو اس پر سال گذرنا چاہیے، یا سال کی ابتداء و انتہا میں نصاب کے مکمل ہونے کی وجہ سے درمیان میں مقدارِ نصاب میں کمی کا کوئی اثر نہیں پڑے گا؟

احناف کے نزدیک اگر درمیان میں وہ نصاب بالکل ختم ہو گیا، تب تو آئندہ از سر نو حساب ہو گا لیکن اگر صرف کمی ہوئی اور پھر اختتامِ سال تک نصاب پورا ہو گیا تو از سر نو سال کا گذرنا ضروری نہیں، شوافع اور دوسرے فقہاء کے نزدیک اس صورت میں بھی اس کو دوبارہ مکمل نصاب کا مالک بننے کے بعد از سر نو سال گذرنے کا حساب کرنا ہو گا(۱) ظاہر ہے کہ احناف کے مسلک میں احتیاط کا پہلو غالب محسوس ہوتا ہے ـــــ اور فقراء کے پہلو کی زیادہ رعایت بھی ہے!

مدّتِ زکوٰۃ کی حکمت

زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے شریعت نے جو مدت مقرر کی ہے اس میں بھی بڑی مصلحت ہے، تجارت کے نفع و نقصان کا صحیح اندازہ سال مکمل ہونے پر ہی ہوتا ہے، اسی لیے پوری دنیا میں ہر جگہ عام طور پر نفع و نقصان، ٹیکس اور لگان وغیرہ میں کم و بیش کا حساب پورے سال پر مبنی ہوتا ہے، اسی طرح اکثر مویشیوں میں توالد و تناسل کا مرحلہ قریب ایک سال کی مدت میں انجام پاتا ہے۔ سال میں مختلف موسموں کے آنے کی وجہ سے نفع و نقصان کا صحیح حساب لگایا جا سکتا ہے اور جانوروں کی افزائش اور ان کی بقاء کا صحیح اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے اس لیے زکوٰۃ کی مدت بھی سالانہ رکھی گئی ہے۔

زمین کی پیداوار اور پھلوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ہر فصل پر اس فصل کی آمدنی کا حساب مکمل ہو جاتا ہے، اس لئے ضروری تھا کہ ہر فصل کی زکوٰۃ اس فصل کے ہاتھ آنے پر وصول کر لی جائے، چنانچہ زمین اور درختوں کی پیداوار کے لیے ایک سال گذرنے کی قید نہیں رکھی گئی ہے۔ یہی حال دفینوں اور کانوں کا ہے، پہلی بار ان کے حاصل ہونے پر پانچواں حصہ غریبوں کا متعین کیا گیا ہے، اس لیے کہ یہ نفع محض ہے، نہ اس میں حساب و کتاب کا مسئلہ ہے نہ

(۱) بدائع الصنائع ۲/۱۴

نقصان کا اندیشہ ہے اور نہ ہی کسی بڑی محنت اور کاوش سے گذرنا ہوتا ہے، اس لئے ان کی زکوٰۃ میں بھی سال کی قید نہیں رکھی گئی ہے۔

کیا دیون زکوٰۃ کے واجب ہونے میں مانع ہے؟

اسی سلسلے میں یہ مسئلہ بھی آتا ہے کہ انسان کے ذمہ جو "دیون وواجبات" ہوتے ہیں وہ زکوٰۃ واجب ہونے اور نہ ہونے میں مؤثر ہیں یا نہیں؟ یعنی اگر ایک شخص نصاب زکوٰۃ کا مالک ہے لیکن اتنا مقروض بھی ہے کہ قرض ادا کرنے کے بعد نصاب زکوٰۃ کا مالک نہیں رہتا ہے تو کیا اسے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟ یا نصاب زکوٰۃ کا مالک باقی رہتا ہے تو اب پورے مال کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی یا اتنی مقدار مستثنیٰ کر کے باقی کی زکوٰۃ ادا کرے گا؟

فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے، احناف کے نزدیک جو دیون بندوں کی طرف سے ہوں مثلاً قرض، خرید کئے ہوئے سامان کی قیمت، اس کے ہاتھوں ضائع شدہ سامان کا تاوان، خوں بہا وغیرہ، یہ زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع ہیں(۱) اور دیون کو مستثنیٰ کر کے زکوٰۃ واجب کی جائے گی، امام احمدؒ سے اموال باطنہ یعنی سونا، چاندی، نقد اور سامانِ تجارت کے بارے میں تو ایک ہی قول منقول ہے کہ دَین کو منہا کیا جائے گا، البتہ اموالِ ظاہرہ یعنی جانور اور اجناس کے بارے میں دونوں طرح کی رائیں منقول ہیں(۲) مالکیہ کے نزدیک بھی "دَین" زکوٰۃ میں مانع ہے اور اس کو منہا کیا جائے گا بہ شرطیکہ اس کے پاس اتنا سامان نہ ہو کہ اس سے دَین ادا ہو سکے(۳) البتہ مویشی، زراعتی پیداوار اور معدنیات کی زکوٰۃ ان کے ہاں بہر طور واجب ہوگی اور دَین اس سے منہا نہ کیا جائے گا۔(۴)

امام شافعیؒ کی قدیم رائے بھی انھیں فقہاء سے قریب تھی، مگر ان کے جدید قول کے مطابق دَین کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور اس کے پاس موجود کل مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔(۵)

جن حضرات نے دَین کو منہا کیا ہے اور اس کو زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع تسلیم کیا ہے ان کی دلیل حسب ذیل ہے:

۱ - حضرت عثمان غنیؓ رمضان المبارک میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ تمہاری زکوٰۃ کی ادائیگی کا

(۱) ہندیہ ۱/۱۷۲ (۲) المغنی ۳۴۲/۲ (۳) بدایۃ المجتہد ۱/۲۴۶
(۴) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱/۷۴۹ (۵) شرح مہذب ۳۴۳/۵

مہینہ ہے اس لیے تم اپنے دَین ادا کرلو جو مال بچ رہیں ان کی زکوٰۃ ادا کرو حتی تحصل اموالکم فتؤدوا منها الزکوٰة۔(۱)

۲ - حضرت عبداللہ بن عمرؓ راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے پاس ہزار درہم ہوں اور اس پر ہزار درہم دَین ہے، اس پر زکوٰۃ نہیں۔(۲)

۳ - آپ ﷺ نے اغنیاء پر زکوٰۃ واجب قرار دی ہے اور جب ایک شخص پر دَین ہے تو وہ بہ ظاہر مال دار ہونے کے باوجود "غنی" نہیں ہے۔

حافظ ابن رشدؒ نے اس پر بحث کرتے ہوئے مسئلہ کی اصل روح کو واضح کیا ہے کہ اصل اختلاف اس بات میں ہے کہ زکوٰۃ کی حیثیت عبادت کی ہے یا یہ محتاجوں کا اس کے مال میں حق ہے؟ اگر حق ہے تو زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہئے، اس لیے کہ خود "صاحب دَین" کا حق ان مسکینوں کے حق سے مقدم ہے اور اگر عبادت ہے تو واجب ہونی چاہیے اس لیے کہ زکوٰۃ ملکیتِ مال کی وجہ سے واجب ہوتی ہے اور وہ موجود ہے(۳) لیکن حقیقت یہ ہے کہ عبادت ہو تو بہ درجہ اولی واجب نہ ہونی چاہیے اس لیے کہ عبادات میں شریعت نے بہ مقابلہ حقوق الناس کے زیادہ سہولت ورعایت رکھی ہے۔

فقہ حنفی کی تفصیلات

فقہ حنفی میں اس مسئلہ کی تفصیل یوں ہے کہ:

۱ - زمین کی پیداوار پر دَین کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور اس سے دَین منہا نہیں کیا جاسکتا، یہی حکم صدقۃ الفطر، قربانی اور کفارات کا ہے۔(۴)

۲ - اگر نصاب زکوٰۃ کا مالک ہوا اور اس پر سال بھی گذر چکا، پھر اس پر دَین واجب ہوا، تو اب اس سال گذشتہ کی زکوٰۃ بہر حال اس پر واجب رہے گی۔(۵)

۳ - نصاب زکوٰۃ کا مالک ہونے کے بعد سال گذرنے سے پہلے ہی اس پر دَین ہوگیا تو یہ دَین زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع ہوگا۔(۶)

(۱) مؤطا امام محمد ۱۲۸ (۲) المغنی ۳۴۲/۲
(۳) بدایۃ المجتہد ۱/۲۴۶ (۴) ردالمحتار ۶/۲
(۵) ہندیہ ۱/۱۷۳ (۶) یہ امام محمدؒ کا قول ہے، امام ابو یوسفؒ کا قول اس کے خلاف ہے، حوالہ سابق

۴ - وہ "دَین" جو حقوق اللہ کے تحت واجب ہوں، بندوں کی طرف سے اس میں کوئی مطالبہ نہ ہو، جیسے نذر، کفارات، صدقۃ الفطر اور حج، تو یہ زکوۃ واجب ہونے میں مانع نہ ہوں گے۔(۱)

۵ - "دَین" چاہے نقد کا ہو، سونے چاندی کا ہو، کپڑا یا حیوان کا ہو یا کسی اور شکل میں، سبھی زکوۃ میں مانع ہونے میں یکساں ہیں۔(۲)

بیوی کا مہر

۶ - بیوی کا مہر جو بہ دیر ادا طلب ہو، زکوۃ واجب ہونے میں مانع ہوگا یا نہیں؟---- اس بارے میں عام طور پر متقدمین یہی کہتے ہیں کہ یہ "دَین" بھی دوسرے دیون کی طرح زکوۃ واجب ہونے میں مانع ہوگا اور یہی اصول کا تقاضہ ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مہر کی ادائیگی میں غفلت و کوتاہی بھی ایک عرصہ سے جاری ہے اور اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے متاخرین فقہاء نے مہر کو زکوۃ میں مانع تسلیم نہیں کیا ہے، عالم گیری میں، جواہر الفتاویٰ سے نقل کیا گیا ہے۔

قال مشائخنا فی رجل علیہ مھر مؤجل لامرأتہ وھو لا یرید اداء ہ لا یجعل مانعا من الزکوۃ لعدم المطالبۃ فی العادۃ . (۳)

ایسا شخص جس پر مہر مؤجل باقی ہو، لیکن ادا کرنے کا ارادہ نہ ہو، تو ہمارے مشائخ نے کہا کہ یہ مہر زکوۃ سے مانع نہ ہوگا، اس لیے کہ عادۃً اس کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔

دیون کو ادا کرنے میں ترتیب یہ ہوگی کہ:

اگر ایک شخص کے پاس مال زکوۃ کے سوا ذاتی استعمال اشیاء موجود ہوں تو دَین کو اس سے منہا نہ کیا جائے گا، اور وہ بدستور زکوۃ سے مستثنیٰ رہیں گی(۴) سب سے پہلے روپے پیسے اور سونے چاندی سے، پھر مال تجارت سے "دَین" کا حساب کیا جائے گا(۵) یہ نہ ہوں یا کافی نہ ہوں تو پھر مویشی سے حساب ہوگا۔(۶)

(۱) بدائع الصنائع ۲/۸
(۲) فتاویٰ تاتارخانیہ ۲/۲۸۷
(۳) ا/۱۷۳، نیز دیکھئے: تاتارخانیہ ۲/۲۹۱
(۴) بدائع الصنائع ۲/۸
(۵) حوالہ سابق
(۶) بدائع الصنائع ۲/۸

طویل مدتی قرضہ جات

ہمارے زمانے کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ "طویل مدتی قرضوں" کا کیا حکم ہوگا؟ صنعتی اور ترقیاتی نیز دوسرے مقاصد کے لیے حکومت اور بعض نجی یا سرکاری و نیم سرکاری ادارے ایسے طویل المیعاد قرض فراہم کرتے ہیں جن کو بعض اوقات ۲۵؍۳۰ سال کی طویل مدت میں ادا کرنا ہوتا ہے اور ہر سال اس کی ایک معمولی سی قسط ادا کی جاتی ہے، ایسی صورت میں اگر ہر سال اس بڑی رقم سے قرض کو مستثنیٰ کیا جاتا رہے تو ایک بڑی رقم سے غریبوں کو ان کا حق نہیں مل سکے گا، پس آیا اس خصوصی پس منظر میں اس مسئلہ میں غور کرنے کی گنجائش ہے؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ گو عام طور پر فقہا نے "دَین مؤجل" اور "دَین معجّل" کا اس مسئلہ میں ایک ہی حکم رکھا ہے، لیکن بعض روایات اس کے خلاف بھی موجود ہیں۔ فقہا احناف میں مجد الائمہ سرخکی نے اپنے مشائخ سے نقل کیا ہے کہ دَین مؤجل وجوب زکوۃ میں مانع نہیں، **و ذکر مجد الائمہ السرخکی عن مشائخہ انہ لا یمنع** .(۱) شامی میں خود امام ابو حنیفہؒ کا ایک قول بھی اسی طرح کا نقل کیا گیا ہے اور قہستانی کے حوالہ سے "جواہر" کا یہ بیان بھی نقل کیا گیا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ ایسا دَین زکوۃ میں مانع نہیں ہے(۲) اور مذکورہ صورت میں یہ بات قرینِ قیاس بھی ہے کیوں کہ زکوۃ میں وہ پہلو راجح ہوتا ہے جس میں فقراء کا فائدہ ہو اور اصحاب مال کے ساتھ ناانصافی بھی نہ ہو، اگر اصحاب مال کسی رخصت کا ایسا استعمال کرنے لگیں کہ اس سے غرباء کو نقصان پہنچنے لگے تو ایسے مواقع پر فقہاء نے زکوۃ کی روح کو سامنے رکھ کر استثناء سے بھی کام لیا ہے، اس کی واضح مثال "مہر مؤجل" ہے۔ جس کو متقدمین نے مانع زکوۃ مانا تھا مگر متاخرین نے اپنے زمانے کے حالات و اطوار کو سامنے رکھ زکوۃ میں مؤثر مانا ہے۔

لہٰذا یہ بات بھی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسے طویل المیعاد قرض کی سالانہ قسط کو مستثنیٰ کر کے بقیہ مال پر بلالحاظ مقدارِ قرض زکوۃ واجب قرار دی جائے۔

(۱) تاتارخانیہ ۲/۲۹۲
(۲) ردالمحتار ۲/۵

باب : ۳

اموال زکوٰۃ اور نصاب زکوٰۃ

اموالِ زکوۃ اور نصابِ زکوۃ

شریعت میں انسانی حالات وضروریات کی جو رعایت کی گئی ہے، اس کا مظہر یہ ہے کہ ہر مال میں زکوۃ واجب قرار نہیں دی گئی، بلکہ مال کی کچھ مخصوص اقسام میں ہی زکوۃ عائد کی گئی، اور وہ حسب ذیل ہیں :

معدنی اشیاء میں : سونا چاندی جو ثمن کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ کاغذی نوٹ اور سکے وغیرہ بھی اسی حکم میں ہیں۔

سامانِ تجارت : خواہ کوئی سا بھی سامان ہو۔

مویشیوں میں : اونٹ، گائے، بیل اور بکریاں۔ گھوڑوں پر زکوۃ واجب ہونے نہ ہونے میں اختلاف ہے۔

زرعی پیداوار : تمام اجناس اور پھل، البتہ ترکاریوں اور ناپائیدار پھلوں کے بارے میں اختلاف ہے۔

کان : زمین سے نکلنے والے تمام معادن اور دفینے۔

ان میں پہلے تینوں اموال وہ ہیں جن میں ایک مخصوص مقدار پر ہی زکوۃ واجب ہوتی ہے، اسی مقدار کو "نصاب زکوۃ" کہا جاتا ہے، زرعی پیداوار میں بعض فقہاء کے ہاں نصاب ہے اور بعضوں کا خیال ہے کہ کسی مقدار کی تحدید نہیں، کم وبیش سب پر زکوۃ واجب ہوگی۔ معدنی کانوں میں بھی یہی اختلاف ہے۔ نیچے انھیں "اموالِ زکوۃ" پر گفتگو کی جاتی ہے :

سونے چاندی میں زکوٰۃ

سونے چاندی میں زکوٰۃ کی فرضیت قرآن، حدیث اور اجماع تینوں سے ثابت ہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے :

والذین یکنزون الذهب والفضة ولا ینفقونها فی سبیل الله
فبشرهم بعذاب علیم. (توبہ : ۳۴)

جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خبر دیدیجئے !

ایسی شدید وعید کسی فریضہ ہی کے ترک پر ہو سکتی ہے، اور مالی عبادات میں فرض کا درجہ اسی "زکوٰۃ" کو حاصل ہے۔

حدیثیں اس کثرت سے اس پر شاہد ہیں کہ حدیث کی شاید ہی کوئی کتاب اس مضمون کی روایت سے خالی ہو، فقہاء بھی اس پر متفق ہیں اور کوئی قابلِ ذکر اختلاف اس مسئلہ میں موجود نہیں(۱)—— سونے اور چاندی کے سلسلے میں کئی باتیں قابل ذکر ہیں :

سونے چاندی میں زکوٰۃ کے مسئلہ میں کئی قابل ذکر امور ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱ - سونے اور چاندی کا نصاب۔

۲ - سونے اور چاندی کا نامکمل نصاب ایک دوسرے کے ساتھ ضم کیا جائے گا، اور زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

۳ - مقدارِ نصاب پر ایسا اضافہ جو "پانچویں حصہ - (۱/۵) سے کم ہو بھی قابل زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

۴ - سونے اور چاندی میں کھوٹ کے حصہ کا کیا حکم ہوگا؟

۵ - سونے اور چاندی کے زیورات پر زکوٰۃ کا مسئلہ۔

۶ - سونے اور چاندی میں زکوٰۃ کی مقدار۔

سونے چاندی کا نصابِ زکوٰۃ

شریعت میں مختلف اشیاء میں زکوٰۃ کے لیے نصاب مقرر کیا گیا ہے، انھیں اشیاء میں سونا،

(۱) المغنی ۲/۳۱۷

اور چاندی ہے، عہد نبوی ﷺ میں انہی دونوں دھاتوں کے سکّے چلتے تھے اور ذریعۂ تبادلہ بنتے تھے، سونے کا سکہ دینار اور چاندی کا "درہم" کہلاتا تھا، ان دونوں سکوں میں سونے اور چاندی کی مخصوص و مقرر مقدار رہا کرتی تھی۔ اسی کو معیار بنا کر آپ ﷺ نے سونے اور چاندی کا نصاب مقرر کیا اور فرمایا کہ بیس دینار سونا اور دوسو درہم چاندی ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی(۱) اسی بنیادی بات پر تمام فقہاء کا اجماع واتفاق ہے۔(۲)

مگر سکے چوں کہ حکومتوں اور وقت ورواج کے مطابق ڈھلا کرتے تھے اور اس کی زمام عام انسانی ہاتھوں میں تھی۔ اس لیے درہم و دینار میں بھی تفاوت ہوتا رہا، پھر بتدریج سونے اور چاندی کے سکوں کا رواج ختم ہوتا گیا یا باقی رہا تو عہد نبوت کے درہم و دینار کی مقدار سے اس کا کوئی تناسب باقی نہیں رہا، اوزان اور پیمانے بھی بدل گئے۔ اس لیے ضرورت درپیش ہوئی کہ مروجہ اوزان میں چاندی اور سونے کی اس مقدار کو متعین کیا جائے، مختلف اہلِ علم نے اپنے عہد میں اس سلسلے میں کاوشیں کیں اور برصغیر میں ہندو پاک کے علماء نے بھی اس سلسلے میں اپنا حصہ ادا کیا۔

نصف صدی پہلے تک ہندوستان میں برطانوی اوزان رائج تھے جس میں تولہ، ماشہ، رتی وغیرہ اوزان رائج تھے۔ اب پوری دنیا میں اس کی جگہ فرانسیسی اوزان نے لے لی ہے اور یہی ہر جگہ مروج ہے، خود ہندوستان میں ۱۹۶۰ء سے یہی اوزان مروج ہیں اور ان اوزان کی بنیاد "گرام" پر ہے۔ سونے چاندی کے نصاب کی برطانوی اوزان سے تعیین ہو جائے تو فرانسیسی اوزان میں ان کو منتقل کرنا چنداں دشوار نہیں۔ اس لیے مختلف اہلِ علم نے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق انہی اوزان میں "درہم اور دینار" کی مقدار متعین کرنے کی سعی مشکور فرمائی ہے۔

ان میں بعض امور تو متفق علیہ ہیں اور بعض امور کی تحقیق میں اختلاف ہے اور اس اختلاف نے نتیجہ کے اعتبار سے خاصا اختلاف پیدا کردیا ہے۔ اس لیے پہلے علماء ہند کی رائیں ذکر کی جاتی ہیں۔ پھر ان امور کا ذکر ہوگا جن پر سبھوں کا اتفاق ہے اس کے بعد ان امور کا جن کی تعیین و تحقیق میں اختلاف ہے اور آخر میں اس رائے کی تعیین جو اس فقیر کی رائے میں راجح ہے۔

(۱) ابوداؤد عن علی ۱/۲۲۱ باب فی زکوٰۃ السائمۃ (۲) رحمۃ الامہ : ۱۰۴

علما کی رائیں

علماء کی ایک بڑی تعداد کا خیال ہے کہ چاندی کا نصاب ۱/۲-۵۲ تولہ اور سونے کا ۱/۲-۷ تولہ ہے۔ یہ رائے مفتی عزیز الرحمن عثمانی(۱) مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ(۲) اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ(۳) کی ہے اور ہندوستان کے بعض قدیم فتاویٰ میں بھی یہی رائے منقول ہے۔(۴) مفتی کفایت اللہ صاحبؒ دہلوی کی رائے میں نصاب کی تعداد اس سے بھی زیادہ یعنی ۵۴ تولہ دو ماشہ چاندی اور سات تولہ ساڑھے آٹھ ماشہ سونا ہے(۵) تاہم مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے اس اختلاف کو محض لفظی فرق قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ حقیقۃً دونوں برابر ہیں، کیوں کہ انھوں نے باون ۵۲ تولے چھ ۶ ماشے دہلی کے قدیم تولے سے بتایا ہے، اور میں نے ۵۴ تولے ۲ ماشہ روپیہ بھر وزن کے تولہ سے جو اب دہلی میں رائج ہے بتایا ہے، قدیم تولہ موجودہ انگریزی روپیہ سے بہ قدر ۱/۲-۴ رتی کچھ زیادہ تھا(۶) موجودہ علماء میں مولانا مفتی رشید احمد صاحب نے مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تحقیق کے طریقہ سے بعض نکات پر اختلاف کیا ہے اور ان کی تحقیق میں نصاب زکوٰۃ ۱/۲ ۵۲ تولہ چاندی اور ۱/۲ ۷ تولہ سونا سے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن از راہ احتیاط مفتی صاحبؒ ہی کی رائے پر فتویٰ دیتے ہیں(۷) بعض دوسرے اہلِ علم و تحقیق کی ایک قابل لحاظ تعداد ہے، جس کا خیال ہے کہ چاندی کا نصاب ۳۶/ تولہ ۱/۲ ۵ ماشہ اور سونے کا نصاب ۵/ تولہ ۱/۲ ۲ ماشہ ہے ملا مبین اور ان کے فرزند مولانا معین الدین کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ :

> پس بر آنکہ دو صد درم کہ نصاب زکوٰۃ است بایں حساب سی و شش تولہ و پنج و نیم ماشہ می شود ـــــ بست مثقال بہ مقدار شصت و دو و نیم ماشہ می شود و آں بحساب تولہ پنج تولہ و دو و نیم ماشہ شد۔(۸)

جان لو کہ دو سو درہم جو نصابِ زکوٰۃ ہے اس حساب سے ۳۶/ تولہ اور ساڑھے پانچ ماشہ ہوتا ہے اور ۲۰/ مثقال ساڑھے باسٹھ ماشہ، جو تولہ کے حساب سے پانچ تولہ ڈھائی ماشہ کے برابر ہوتا ہے۔

---

(۱) فتاویٰ دار العلوم ۱۳۵/۶ (۲) فتاویٰ رضویہ ۴۰۷/۴، ط: کراچی
(۳) جواہر الفقہ ۴۰۷/۱ (۴) فتاویٰ حمادیہ ۴۳/۱
(۵) کفایت المفتی ۲۵۳/۴ (۶) کفایت المفتی ۲۵۳/۴
(۷) احسن الفتاویٰ ۳۸۲/۴ (۸) کنز الحسنات فی نصاب الزکوٰۃ: ۵

خود خاتم الفقہا مولانا عبد الحئی فرنگی محلی نے بھی اسی کو ترجیح دیا ہے(۱) جنوبی ہند کے علماء محققین اور اصحاب فتاویٰ نے بھی ہمیشہ اسی پر فتویٰ دیا ہے(۲) اسی کو ماضی قریب کے اہل تحقیق علماء میں مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی نے اختیار فرمایا ہے۔(۳)

اس طرح سونے، چاندی کے نصاب زکوٰۃ سے متعلق یہ درج ذیل دو بنیادی اور معروف اقوال ہیں، چوں کہ ادھر کوئی ساٹھ سال سے ہندوستان میں فرانسیسی اوزان یعنی گرام اور کیلو گرام رائج ہوگئے ہیں اس لیے میں ذیل میں وہ مساوی اوزان بھی درج کیے جارہے ہیں :

۱/۲ - ۵۲ تولہ - ۶۱۲٫۳۵ گرام
۱/۲ - ۷ تولہ - ۸۷٫۴۷۹ گرام(۴)
۱/۲ - ۳۶ تولہ - ۴۲۵٫۲۴۲ گرام
۱/۲ - ۵ تولہ - ۶۰٫۴۸۶ گرام(۵)

درہم و دینار کے وزن سے متعلق متفق علیہ اُصول

درہم اور دینار کے سلسلہ میں جن باتوں کے بارے میں اتفاق ہے وہ یہ ہیں :

۱ - درہم کا وزن ایسا ہو کہ دس درہم سات مثقال کے برابر ہو، اس کی اصل یہ ہے کہ اوائل اسلام میں تین قسم کے درہم مروج تھے، دس درہم دس مثقال کے برابر دس درہم چھ مثقال کے برابر، دس درہم پانچ مثقال کے برابر، چوں کہ وزن کا یہ فرق یعنی دین میں بعض اوقات اختلاف کا موجب ہو جایا کرتا تھا، اس لیے حضرت عمرؓ نے یہ تدبیر کی کہ تینوں قسم کے درہم میں سے ایک ایک تہائی وزن لے کر درہم کو صحیح معیار قرار دیا، پس اوپر ذکر کی گئی تفصیل کے مطابق تینوں قسم کے دس دس درہم ملا کر وزن کے حساب سے اکیس مثقال ہوئے، حضرت عمرؓ نے ان سب کی رعایت کرتے ہوئے ایسے درہم کو اصل قرار دیا جن میں سے دس سات مثقال کے برابر ہو(۶) اسی کو فقہ کی

---

(۱) عمدۃ الرعایہ، باب زکوٰۃ الاموال ۱۸۵/۱
(۲) ملاحظہ ہو، تحفۃ الصوفیہ، مؤلفہ حضرت سید شاہ احمد علی صاحبؒ صوفی قادری
(۳) کتاب العشر والزکوٰۃ ۷۱-۱۶۸ (۴) احسن الفتاویٰ ۲۵۳/۴
(۵) تحفۃ الصوفیہ ۳۴-۵ (۶) رد المحتار ۲۸/۲-۲۹

کتابوں میں "وزن سبعہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲ - اس طرح ایک دینار (مثقال) بیس قیراط اور درہم چودہ قیراط کا ہوا کرتا ہے۔

۳ - ایک قیراط کو پانچ ایسی جو کے برابر مانا گیا ہے جس پر چھلکا ہو اور اس کے دونوں طرف کا باریک اور لمبا تنکا کاٹ دیا گیا ہو اور جو کے یہ دانے درمیانہ ہوں۔(۱)

۴ - اس حساب سے ایک درہم ستر جو اور ایک دینار سو جو کے برابر قرار پاتا ہے۔(۲)

وجہ اختلاف

اصل اختلاف دراصل "جو" کا وزن مقرر کرنے میں واقع ہوا ہے اور واقعہ ہے کہ جو کے سلسلے میں فقہا نے متوسط اور دم بریدہ ہونے کی جو شرط لگائی ہے، اس کی صحیح اور قطعی تعیین میں اختلاف رائے کا پایا جانا عین مطابق فطرت ہے۔ یہ تفاوت ابتداء تو بہت خفیف سا محسوس ہوگا، لیکن آگے چل کر قابل لحاظ فرق پیدا ہو جائے گا، جس کا اندازہ اوپر ذکر کی گئی آراء کے اختلاف سے کیا جا سکتا ہے۔

علماء فرنگی محل وغیرہ کی دلیل

مولانا فرنگی محلی وغیرہ نے ستر جو کو دو ماشہ ڈیڑھ رتی اور سو جو کو تین ماشہ ایک رتی قرار دیا ہے، اس لیے کہ ان حضرات کے نزدیک چار جو ایک رتی کے برابر ہے(۳) اور آٹھ رتی کا ایک ماشہ ہوا کرتا ہے، یہی حساب ملا مبین کے لڑکے مولانا معین نے بھی لکھا ہے:

"ورتی ایں شہر کہ آنرا در فارسی سرخ و در ہندی گھنگچی نامند بقدر چہار جواست"(۴)

اس حساب سے دو سو درہم کے چھتیس تولے ساڑھے پانچ ماشے اور بیس مثقال کے پانچ تولے ڈھائی ماشے ہوتے ہیں، مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی کا نقطۂ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی اوزان میں سناری وزن کا جو اصول مروج ہے، وہ یہی کہ چار جو ایک رتی کے برابر سمجھی جائے گی، پس اس اصول پر ہی زکوۃ کے نصاب کا بھی تعین کیا جائے گا(۵) مولانا رحمانی کی اس

(۱) رد المحتار ۲/۲۹ (۲) در مختار علی ہامش الرد ۲/۲۹ (۳) تحفۃ الصوفیہ ص: ۲۸
(۴) فتاویٰ کنز الحسنات فی ایتاء الزکوۃ ص: ۵ (۵) دیکھیے: کتاب العشر والزکوۃ ص: ۱۶۸ (حاشیہ)

تحقیق میں یہ پہلو بہر حال قابل توجہ ہے کہ اوزان شرعیہ میں مروجہ معیار کی جگہ فقہا کی تصریحات زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، مروجہ اوزان میں مطلق چار جو کو ایک رتی کے برابر مانا گیا ہے، جو کی کوئی خاص مالیت مقرر نہیں کی گئی ہے، فقہاء نے ایسے چار جو کو معیار بنایا ہے جو درمیانہ ہوں اور دونوں طرف سے کنارے کٹے ہوئے ہوں۔ پس اس معیار کے وزن کا جو کم ہو اور مطلق جو کا وزن زیادہ ہو تو تعجب نہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ وغیرہ کا نقطہ نظر

مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور عام علماء کی رائے یہ ہے کہ ستر جو پچیس رتی اور سو جو چھتیس رتی سے کم نہیں(۱) اس طرح ان حضرات کے یہاں ایک درہم تین ماشہ ایک رتی اور ایک دینار چار ماشہ چار رتی کے برابر ہوا۔ اس طرح دو سو درہم چھ سو تیس ماشہ یعنی ساڑھے باون تولہ قرار پایا(۲) مولانا احمد رضا خاں صاحبؒ نے اس پر یوں استدلال کیا ہے کہ جواہر الاخلاطی میں ایک درہم شرعی ۲۵-۱/۵ رتی قرار دیا گیا ہے اور کشف الغطاء میں لکھا ہے کہ ایک مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہوتا ہے، پس اب حساب سے واضح ہو سکتا ہے کہ دو سو درہم نصاب فضہ کے باون تولے چھ ماشے اور بیس مثقال نصاب ذہب کے سات تولے چھ ماشے۔(۳)

مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنے تجربہ کے بعد اختلاف کی یہ وجہ بتائی ہے کہ مولانا عبد الحئی صاحبؒ نے غالباً درہم و دینار کے وزن کی تحقیق کے لیے ستر جو اور سو جو کو وزن نہیں کیا، بلکہ صرف چار جو کا وزن کیا، جو ایک رتی کے مساوی محسوس ہوا اور اسی کو پورے نصاب زکوۃ کے حساب کے لیے معیار بنایا، حالاں کہ چار جو کا وزن ایک رتی سے کم ہے جو خفیف سا فرق ہونے کی وجہ سے محسوس نہیں ہو پاتا۔ واقعہ ہے کہ مفتی صاحب کی یہ بات قرین قیاس محسوس ہوتی ہے ــــــ لیکن مفتی صاحب کی مقررہ مقدار بھی تخمین و تقریب ہی کا درجہ رکھتی ہے، اس لیے کہ درہم و دینار کی مقررہ مقدار کے اعتبار سے سات دینار اور دس درہم کا وزن برابر ہونا چاہیے، جب کہ مفتی صاحب کے حساب سے سات دینار دو سو باون رتی اور دس درہم دو سو پچاس رتی کے برابر ہوتے ہیں اور دونوں کی مقدار میں دو رتی کا فرق ہو جاتا ہے، اگر

(۱) جواہر الفقہ ۱/۴۱۴ (۲) فتاویٰ دار العلوم دیوبند ۶/۴۳
(۳) فتاویٰ رضویہ ۴/۴۱۱

دینار کے اس حساب کو مانا جائے تو چاندی کے نصاب "ساڑھے باون تولہ" میں مزید بیس رتی کا اضافہ ہونا چاہیے تاہم احتیاط کا پہلو ساڑھے باون تولہ ہی کو نصاب ماننے میں ہے۔

خلاصۂ بحث

پس حاصل یہ ہے کہ نصاب زکوٰۃ کے سلسلے میں زیادہ صحیح اور محقق رائے یہی ہے کہ ساڑھے باون تولہ چاندی (۶۱۲٫۳۵ گرام) اور ساڑھے سات تولہ سونا (۸۷٫۴۷۹ گرام) زکوٰۃ کا نصاب ہے، یہی رائے ہندوستان کے قدیم مصنفین نیز موجودہ دور کے اکثر علماء کی ہے اور اسی پر فتویٰ بھی ہے —— تاہم جو لوگ ساڑھے چھتیس تولہ ۳۶-۱/۲ (۴۲۵٫۲۴۲ گرام) چاندی اور ساڑھے پانچ تولہ (۶۰٫۷۴۸۶ گرام) سونا کو نصاب مان کر عمل کرتے ہوں وہ مزید احتیاط کی روش پر قائم ہیں اور انشاء اللہ وہ ضرور اس کا اجر پائیں گے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

سونا چاندی کا باہم ملایا جانا

اگر سونا اور چاندی دونوں تھوڑی مقدار میں ہوں اور دونوں کا نصاب نامکمل ہو تو آیا ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی؟ —— اس میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک دونوں کو ملا کر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی (۱) امام شافعیؒ کے نزدیک یہ دونوں ملائے نہیں جائیں گے، امام احمدؒ سے دونوں طرح کے اقوال منقول ہیں (۲) البتہ خود فقہاء احناف کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ ان دونوں کے نامکمل نصاب قیمت کے اعتبار سے ملائیں گے یا اجزاء کے لحاظ سے؟ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قیمت کے اعتبار سے اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اجزاء کے اعتبار سے (۳) یعنی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک سونے اور چاندی کے نامکمل نصاب میں سے ہر ایک کی قیمت لگائی جائے گی اور اگر وہ قیمت اتنی ہو جائے کہ اس سے کسی بھی ایک کا اور فی زمانہ چاندی کا یہ مقدار نصاب خرید کیا جاسکے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کا منشاء یہ ہے کہ مثلاً سونے کا نصف اور

(۱) بدایۃ المجتہد ۱/۲۵۷ (۲) المغنی ۲/۳۱۸

(۳) ہدایہ مع الفتح ۲/۱۶۹

چاندی کا نصف یا سونے کا ایک تہائی اور چاندی کا اس کے وزن کے اعتبار سے دو تہائی نصاب کا مالک ہو جائے تو مجموعہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی —— اس اختلاف رائے کا اثر اس مثال میں سمجھا جاسکتا ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ ایک شخص پونے چار تولہ سونا کا مالک ہے جو ساڑھے سات تولہ سونے کی نصف مقدار نصاب کا مالک ہے اور اس کے پاس ۱۳ تولہ ۳ ماشہ چاندی بھی ہے جو چاندی کے نصاب ۵۲-۱/۲ تولہ کا چوتھائی ہے تو اس طرح نصف اور ربع مل کر ہر دو کے مجموعی نصاب کا تین چوتھائی یعنی ۳/۴ رہ گیا ہے اور نصاب میں ۱/۸ کی کمی رہ گئی، اس شخص پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی لیکن اگر قیمت کے اعتبار سے سونے کو چاندی کے ساتھ ملایا جائے تو پونے چار تولہ سونے کی قیمت سے چاندی کے کئی نصاب خریدے جاسکتے ہیں —— اس لیے امام صاحبؒ کے نزدیک اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

امام ابو حنیفہؒ کا قول راجح ہے —— اور بعض حضرات نے نقل کیا ہے کہ بعد کو خود امام ابو یوسفؒ نے بھی اس مسئلہ میں اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا (۱) —— اس لیے کہ اول تو امام صاحب کا قول غریبوں کے حق میں زیادہ نافع ہے اور زکوٰۃ کے احکام میں جہاں دو پہلو ہوں، وہاں اس پہلو کو ترجیح دی جاتی ہے جس میں فقراء کا زیادہ فائدہ ہو، دوسرے یہ کہ سونے اور چاندی میں غالباً زکوٰۃ کے مسئلہ میں اصل معیار چاندی ہے، اس لیے بعض فقہاء نے تو سونے کا کوئی نصاب ہی نہیں مقرر کیا ہے اور سونے کی قیمت لگا کر چاندی کے نصاب کے ساتھ اس کی مطابقت یا عدم مطابقت کو ملحوظ رکھ کر زکوٰۃ واجب قرار دی ہے۔ (۲)

یہی حکم سامانِ تجارت کا بھی ہے، سونے یا چاندی کی کچھ مقدار ہو اور کچھ مالِ تجارت، تو دونوں کی قیمت لگا کر دیکھا جائے گا، اگر ان دونوں کی مجموعی قدر سے مثلاً چاندی بہ قدرِ نصاب خریدی جاسکتی ہو تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ (۳)

نصاب پر اضافہ

چاندی یا سونے کے نصاب پر اتنا اضافہ ہو کہ وہ اس کی مجموعی مقدار کا پانچواں حصہ (۱/۵) ہو جائے تو اس اضافی حصے پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، اس میں اختلاف نہیں۔ لیکن

(۱) تاتارخانیہ ۲/۲۳۲ (۲) المغنی ۳/۳۱۹، بدایۃ المجتہد ۱/۲۵۵

(۳) ہدایہ مع الفتح ۲/۱۶۹

اگر یہ اضافہ پانچویں حصہ سے کم ہو تو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک پانچویں حصہ سے کم کے اضافہ پر زکوٰۃ نہیں، امام شافعیؒ اور خود امام ابو حنیفہؒ کے دونوں ممتاز شاگردوں قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک مقدارِ نصاب پر جو بھی اضافہ ہو، کم یا بیش اس کے مجموعہ پر بحساب ۲-۱/۲ فی صد زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ اس لیے کہ حضرت علیؓ نے ارشاد نبوی ﷺ نقل کیا ہے کہ چاندی کے نصاب زکوٰۃ دو سو درہم سے زیادہ جتنی بھی چاندی ہو اس پر اسی حساب سے زکوٰۃ واجب ہوگی وما زاد علی المائتین فبحسابه —— اسی میں فقراء کا فائدہ بھی ہے، اور اسی میں احتیاط بھی، امام ابو حنیفہؒ کے نقطہ نظر پر بھی گو بعض روایات سے استدلال کیا گیا ہے، مگر فنی اعتبار سے وہ ضعف سے خالی نہیں ہیں(۱) امام مالکؒ و احمدؒ بھی امام شافعیؒ ہی کے ہم خیال ہیں۔(۲)

سونے چاندی میں ملاوٹ

سونے اور چاندی کو ڈھالنے میں کچھ نہ کچھ ملاوٹ ناگزیر ہے، اس لیے فقہاء کا خیال ہے کہ اگر سونا چاندی کی مقدار غالب ہو اور کھوٹ کم ہو، تو وہ مکمل سونا چاندی ہی سمجھا جائے گا، اگر کھوٹ غالب ہو، تو وہ بحکم سامان ہے، اگر اس کی تجارت کرتا ہو تو قیمت کے لحاظ سے سامانِ تجارت میں زکوٰۃ کے اصول کے مطابق حکم لگایا جائے گا(۳) اور اگر خالص اور کھوٹ کا حصہ برابر ہو، تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلے میں دونوں طرح کی رائیں منقول ہیں، لیکن احتیاط اس میں ہے کہ زکوٰۃ ادا کی جائے۔(۴)

اگر سونا چاندی مخلوط ہو، تو اگر چاندی غالب ہو تو یہ تفصیل ہے کہ سونا مقدارِ نصاب کو پہنچ جائے تو سونے کے ذریعے، اور چاندی تعداد نصاب کو پہنچ جائے تو چاندی کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کی جائے۔ لیکن اگر سونا غالب ہو اور چاندی مغلوب، تو اسی مخلوط سامان کو مکمل سونا تصور کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی(۵) امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا خیال ہے کہ سونا چاندی گو غالب اور کھوٹ اس کے مقابلہ مغلوب ہو، پھر بھی وہ مکمل سونے کے حکم میں نہیں، بلکہ سونے چاندی کی جتنی

---

(۱) ملخص از: فتح القدیر ۲/۱۵۹ (۲) حلیۃ العلماء ۲/۹۱ بدایۃ المجتہد ۱/۲۵۶

(۳) ہدایہ مع الفتح ۲/۱۶۱ (۴) قیل تجب فیہ احتیاطا، فتح القدیر ۲/۱۶۱ نیز دیکھئے: تاتار خانیہ ۲/۱۳۵

(۵) فتح القدیر ۲/۱۶۱

مقدار اس میں موجود ہے اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔(۱)

زیوارت

احناف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ سونا اور چاندی چوں کہ اپنی تخلیق کے اعتبار سے مال و دولت کے تبادلہ کا ذریعہ ہیں اور افزائش ثروت کا ایک اہم عامل ہے اس لیے وہ جس صورت میں بھی ہو "اموال زکوٰۃ" میں داخل ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہے، چاہے وہ زیورات کی شکل میں کیوں نہ ہوں، بہ شرطیکہ سونا اس طرح ہو کہ اس کو علاحدہ کیا جاسکتا ہو(۲) دوسرے فقہاء کے نزدیک عورتوں کے استعمال کے زیورات میں زکوٰۃ واجب نہیں، چاہے ان کی تعداد کتنی بھی ہو —— البتہ اگر زیورات کی تجارت کی جائے یا استعمالی زیورات ہی میں تجارت کی نیت کرلی جائے یا زیورات اس طرح توڑ دیے جائیں کہ قابل استعمال نہ رہیں، تو ان میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔(۳)

واقعہ ہے کہ حدیثیں حنفیہ کے نقطہ نظر کی تائید میں ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ان کے ہاتھ میں چاندی کے چھلے تھے، آپ ﷺ تشریف لے آئے اور ان کی زکوٰۃ کی بابت دریافت فرمایا حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ سامان دوزخ ہے هو حسبك من النار ۔ (۴) ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے، عرض کناں ہوئیں کہ قرآن میں جس "کنز" کی مذمت وارد ہوئی ہے (توبہ: ۳۴) کیا یہ اس میں داخل ہے؟ فرمایا: زکوٰۃ ادا کردی جائے تو داخل نہیں (۵) حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ راوی ہیں کہ ایک خاتون اپنی بچی کو لے کر بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئیں، لڑکی کے ہاتھ میں سونے کے دو موٹے کنگن تھے۔ آپ ﷺ نے ان کی زکوٰۃ کی بابت استفسار فرمایا، انھوں نے عرض کیا کہ زکوٰۃ ادا نہیں کی گئی ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ روز قیامت یہ آگ کے کنگن ہوں گے(۶) —— اس لیے زیورات گو استعمالی ہوں، ان کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۱۷ (۲) حلیۃ العلماء ۳/۹۲

(۳) ملاحظہ ہو: المغنی ۲/۳۲۲-۳۲۳ (۴) ابوداؤد ۱/۲۱۸ باب الکنز ما ھو وزکوٰۃ الحلی

(۵) حوالہ سابق (۶) حوالہ سابق

زکوٰۃ کی مقدار

سونے اور چاندی میں زکوٰۃ بحساب ڈھائی فی صد واجب ہوگی، مثلاً سونے یا چاندی دس ہزار روپے کا ہے، تو ہر ہزار روپیہ پر بہ طور زکوٰۃ ۲۵؍ روپے ادا کیے جائیں گے۔ اس پر فقہاء کا اتفاق ہے، حضرت علیؓ حضور ﷺ سے راوی ہیں کہ دوسو درہم چاندی پر پانچ درہم اور ۲۰ دینار سونے میں آدھا دینار زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔(۱)

نوٹوں پر زکوٰۃ

فی زمانہ کاغذی نوٹوں، مروجہ کرنسیوں اور سکہ ہائے رائج الوقت کی حیثیت قریب قریب مکمل طور پر درہم و دینا کے نقرئی اور طلائی سکوں کی سی ہوگئی ہے اور زمانہ قدیم کے انھی سکوں کی طرح تبادلہ اشیاء کے لیے ذریعہ بنتے ہیں، اس لیے ان میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، چنانچہ ماضی میں بھی فقہانے "فلوس" میں اس کے بغیر بھی زکوٰۃ واجب قرار دی ہے کہ اس میں تجارت کی نیت ہو، ولا تشترط فیھا نیة التجارة (۲) یہی رائے حنفیہ مالکیہ اور شوافع کی ہے۔ حنابلہ کی طرف بھی منسوب ہے کہ وہ کاغذی نوٹوں میں زکوٰۃ واجب ہونے کے قائل ہیں۔(۳)

کرنسیوں کے نصابِ زکوٰۃ کا معیار سونا ہوگا یا چاندی؟ اس میں دونوں پہلو ہیں، چوں کہ فی زمانہ کرنسی کا ربط قانونی طور پر سونے سے ہے نہ کہ چاندی سے، اس لیے یہ بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ سونے کے نصاب کا جو نرخ ہو، وہی کرنسی کے لیے نصاب ہو لیکن چاندی اور سونے کی قیمت میں جو عدم توازن اس زمانہ میں پایا جاتا ہے، اس کے تحت چاندی کا نصاب بہ مقابلہ سونے کے بہت کم قیمت کا ہوتا ہے، اس لیے چاندی کی قیمت سے کرنسیوں کے نصاب کو مربوط کرنے میں فقراء کا فائدہ ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک زکوٰۃ میں وہی پہلو قابلِ ترجیح ہے جس سے فقراء کو نفع ہو، اس لیے موجودہ حالات میں اتنی کرنسی کہ چاندی کے نصاب (۳۵، ۶۱۲ گرام) کی قیمت بن سکے، زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے کافی ہوگی، (۴) نیز جو شرطیں سونے اور چاندی میں زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ہیں وہی اس میں بھی ہوں گی اور جیسے سونا چاندی

(۱) ابوداؤد ۱/۲۲۱ باب زکوٰۃ السائمۃ، عن علی نیز ملاحظہ ہو: ترمذی عن علی ۱/۸۳ باب ما جاء فی زکوٰۃ الذہب والورق
(۲) فتاوی تاتارخانیہ ۲/۲۳۳ (۳) الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱/۴۸۶
(۴) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: جدید فقہی مسائل ۲/۱۱۷ طبع جدید دہلی

احناف کے یہاں ایک دوسرے کے ساتھ ضم کیا جاتا ہے اور ملا کر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، یہی حکم نوٹوں کا بھی ہوگا مثلاً کسی کے پاس چاندی کا آدھا نصاب ہو اور اتنے روپے ہوں کہ ان سے چاندی کا مزید نصاب خرید کیا جاسکتا ہو، تو اب وہ زکوٰۃ نصاب کا مالک ہوگا اور اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، نیز جس طرح سونا چاندی کے ذریعے زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے، اسی طرح نوٹوں کے ذریعے بھی زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے۔

سامانِ تجارت میں زکوٰۃ

شریعت نے جن اموال میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے، ان میں ایک "سامانِ تجارت" ہے، حضرت سمرہ بن جندبؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ ہمیں ان اشیاء کی زکوٰۃ نکالنے کا حکم فرماتے تھے جو فروخت کرنے کے لیے ہوں(۱) مختلف صحابہ کے فتاویٰ بھی اسی کے مطابق ہیں اور یہی عام علماء کی رائے ہے، یہاں تک کہ ابن منذر نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے(۲) یہ عین قرین مصلحت بھی ہے، سونا اور چاندی نیز اونٹ، گائے اور بکریوں میں "نمو" اور "افزائش" کی جو صلاحیت ہے، واقعہ ہے کہ تجارت میں یہ صلاحیت اس سے کہیں فزوں اور چند در چند ہے، اس لیے اس میں غریبوں کا حق متعلق کرنا بالکل منصفانہ بات ہے، اسی لیے فقہاء نے ہر طرح کے تجارتی مال میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے کائنة ما کانت (۳) مالِ تجارت میں زکوٰۃ سے متعلق متعدد احکام ہیں جو وضاحت طلب ہیں:

۱ - زکوٰۃ واجب ہونے کی شرطیں اور اس کا نصاب۔
۲ - کسی شئے کو کب مالِ تجارت سمجھا جائے گا؟
۳ - جو چیزیں بذاتِ خود اموالِ زکوٰۃ میں ہیں مثلاً مویشی، ان کو تجارتی اغراض سے لیا جائے تو زکوٰۃ کس لحاظ سے واجب ہوگی؟
۴ - زکوٰۃ کس صورت سے نکالی جائے گی؟ خود اسی مال و سامان کی صورت میں یا اس کی قیمت کے بہ طور؟ اور قیمت کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کی جائے تو کس وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا؟
۵ - اصل سرمایہ کے ساتھ کیا تجارتی منافع پر بھی سال کا گذرنا ضروری ہوگا یا اصل سرمایہ

(۱) کان یامرنا ان نخرج الصدقة من الذی نعد للبیع، ابوداؤد ۱/۲۲۵
(۲) المغنی ۲/۳۳۵ (۳) ہدایہ مع الفتح ۲/۱۶۶

پر سال گذرنا کافی ہوگا؟

مالِ تجارت کا نصاب

مالِ تجارت میں بھی زکوٰۃ واجب ہونے کی وہی شرطیں ہیں، جو دوسرے اموالِ زکوٰۃ میں ہیں، البتہ حدیث میں اس کے نصاب کی صراحت نہیں ملتی، اس لیے فقہاء نے اس میں قیاس واجتہاد سے کام لیا ہے اور سونے چاندی کے نصاب اور اس میں زکوٰۃ کی مقدار کو "مالِ تجارت" کے لیے بھی معیار بنایا ہے، اس لیے سونا چاندی ہی سرمایہ کی اصل ہیں اور یہی اصل میں مال کے لیے تبادلہ کا ذریعہ ہیں (۱) پس مالِ تجارت چاندی یا سونے کے نصاب کی قوت خرید کو پہنچ جائے تو ڈھائی فی صد کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی (۲) اگر چاندی اور سونے کی قیمت میں اتنا تفاوت ہو جائے کہ سامانِ تجارت ایک قیمت کے لحاظ سے نصاب کو پہنچ جاتا ہے، دوسرے کے لحاظ سے نہیں، تو فقرا کی رعایت کرتے ہوئے اسے مکمل نصاب مانا جائے گا اور زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی، یہ اکثر فقہاء کی رائے ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک یہ سامان ان دونوں میں سے جس کے ذریعے خرید کیے گئے ہوں، انھیں کے ذریعہ نصاب بھی متعین کیا جائے گا (۳) پہلی رائے کے مطابق فی زمانہ چاندی معیار ہوگا، اور یہی صحیح ہے، دوسری رائے پر سونا معیار ہوگا، پھر سکوں کے لیے آج سونا ہی معیار ہے اور چاندی کو قوتِ زر سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے، اور جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے اگر مالِ تجارت نصاب سے کم ہو اور کچھ سونا یا چاندی ہو تو یہ مالِ تجارت بھی سونے چاندی کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے گا، اگر ان کی مجموعی قیمت سے چاندی کا نصاب پورا ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ (۴)

سامان، کب سامانِ تجارت شمار ہوگا؟

کوئی مال کب تجارتی مال تصوّر کیا جائے گا؟ —— اس سلسلے میں فقہا کی تصریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ دو صورتوں میں سامان "تجارتی" سمجھا جائے گا۔ ایک اس وقت جب کہ

(۱) تاتارخانیہ ۳۷/۲ (۲) بدائع الصنائع ۲۱/۲

(۳) المغنی ۳۳۷-۳۱/۳ العلماء ۱۰۳/۳ ہدایہ مع الفتح ۱۶۷/۲

(۴) دیکھئے: ہدایہ مع الفتح ۱۶۹/۲

تجارت کی نیت ہی سے خرید کیا ہو، دوسرے اگر پہلے سے ملکیت میں موجود ہو تو اس وقت جب کہ عملاً اس کو فروخت کر دیا جائے، سامان اگر تجارت کی نیت سے نہیں خریدا، بعد کو تجارت کا ارادہ ہوا، تو محض ارادہ کی وجہ سے اس کا شمار سامانِ تجارت میں نہیں ہوگا جب تک کہ عملاً تجارت نہ کی جائے۔ (۱)

اختلاف اس صورت میں ہے کہ خرید و فروخت کی بجائے کسی اور طریقہ سے مال کا مالک ہو اور مال کا مالک ہوتے وقت تجارت کی نیت کرے تو محض یہ نیت، تجارتی مال بننے کے لیے کافی ہوگی یا نہیں؟ یا فروخت کرنے کے وقت ہی وہ "مالِ تجارت" بنے گا؟ تو اس سلسلے میں ترکہ کا وارث ہوتے ہوئے تجارت کی نیت معتبر نہیں، اس پر اتفاق ہے، اگر تبرع واحسان کے ذریعے مال حاصل ہو، جیسے صدقہ، وصیت، خلع اور صلح وغیرہ، اور مال ملتے وقت ہی تجارت کی نیت کر لے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک نیت معتبر اور امام محمدؒ کے نزدیک غیر معتبر ہوگی، خود امام ابو حنیفہؒ سے دونوں طرح کی رائیں نقل کرنے والوں نے نقل کی ہیں، (۲) حنابلہ کی بھی یہی رائے ہے کہ یہ صورتیں جن میں انسان اپنے فعل مثلاً خرید و فروخت، نکاح، طلاق، یا صدقہ وغیرہ کے قبول کرنے سے مالک بنتا ہے، ایسی ہیں کہ مالک بنتے ہوئے تجارت کی نیت کر لے تو یہ سامانِ تجارت شمار ہوگا (۳) دوسرے فقہا کی رائے ہے کہ آدمی مالی عوض ادا کئے بغیر کسی چیز کا مالک ہو تو اس میں محض نیت کی وجہ سے تجارت کا حکم نہیں لگے گا۔ (۴)

مالِ تجارت کے سلسلے میں ایک نکتہ خصوصیت سے قابلِ لحاظ ہے جس میں بہ قول علامہ ابن ہمامؒ بالعموم لغزش ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ جو سامان، مالِ تجارت سے تبادلہ کے ذریعے حاصل کیا جائے، وہ بہر حال مالِ تجارت شمار ہوگا، خواہ تجارت کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو، اس لیے کہ اس سامان کی حیثیت "مالِ تجارت" کے بدل کی ہے اور جو حکم "اصل" کا ہوتا ہے وہی "بدل" کا ہوتا ہے (۵) البتہ سامانِ تجارت سے مراد روپے نہیں ہیں چنانچہ فقہا نے "درہم و دینار" کو عروضِ تجارت میں شمار نہیں کیا ہے (۶) روپیوں پر مستقل طور سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۱) تاتارخانیہ ۲۳۸-۳۹/۲ (۲) تاتارخانیہ ۲۳۸-۳۹/۲

(۳) المغنی ۲۳۶/۲ (۴) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷۹۰/۲

(۵) فتح القدیر ۶۶/۲ (۶) تاتارخانیہ ۲۳۷/۲

اموالِ زکوٰۃ کی تجارت

وہ اشیاء جن میں بذاتِ خود زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، ان میں بعض تو وہ ہیں جن میں زکوٰۃ کی شرح وہی ہے جو خود مالِ تجارت میں ہے، یعنی سونا اور چاندی، ان کی تجارت کی جائے یا نہ کی جائے، شرح زکوٰۃ یکساں ہوگی لیکن مویشیوں کی تجارت کی جائے تو تجارتی اموال کی طرح ڈھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے یا وہ مقدار جو خود مویشیوں کے لیے مقرر ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ مالکیہ اور شوافع کے نزدیک مویشی کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہوگی اور احناف اور حنابلہ کے یہاں مالِ تجارت کی شرح سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لیے کہ "مالِ تجارت" کے حکم رکھے جانے کی صورت فقراء کے لیے نفع ہے کہ اس میں تمام مویشیوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ مویشیوں کی زکوٰۃ کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب کرنے میں مکمل نصاب اور اس کے بعد مخصوص عددی فاصلہ کے درمیان کے اضافہ پر زکوٰۃ نہیں ہوتی، پانچ اونٹ میں زکوٰۃ ہے، لیکن پھر چھٹے اونٹ سے نویں اونٹ تک زکوٰۃ نہیں۔(۱)

اگر درخت یا زمین تجارتی مقصد کے لیے خرید کیا اور اس میں پھل اور کھیتی ہوئی، تو پھل اور کھیتی پر تو پیداواری عشر ہی واجب ہوگا، لیکن خود درخت اور زمین کی قیمت لگائی جائے گی اور تجارتی شرح سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی، یہ رائے حنفیہ کے علاوہ حنابلہ کی بھی ہے۔(۲)

کوئی سامان تجارت کے ارادہ سے لیا اور بعد کو ارادہ بدل گیا، اب خود اپنے استعمال میں رکھنا چاہتا ہے، تو اب وہ مالِ تجارت باقی نہیں رہا اور اگر وہ مال بجائے خود "مالِ زکوٰۃ" میں داخل نہیں ہے تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، سامانِ تجارت کے "سامانِ استعمال" قرار پانے کے لیے صرف نیت و ارادہ ہی کافی ہے(۳) یہی رائے شوافع اور حنابلہ کی بھی ہے۔(۴)

زکوٰۃ۔ بصورت سامان یا قیمت!

سامانِ تجارت کی زکوٰۃ خود اس سامان کی صورت میں بھی نکالی جاسکتی ہے، جیسے کتاب یا کپڑوں کی زکوٰۃ خود کتاب اور کپڑے کے ذریعے، اور اس کی قیمت کی صورت میں بھی، جس میں فقراء کے لیے بہتری ہو، البتہ اگر قیمت کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کرنا چاہتا ہے تو اتنی قیمت زکوٰۃ میں ادا

(۱) المغنی ۲/۳۳۸ (۲) المغنی ۲/۳۳۸
(۳) الاشباہ والنظائر لابن نجیم : ۲۶ (۴) المغنی ۲/۳۳۸

کی جائے گی جس میں سامانِ تجارت کی وہی ڈھائی فی صد مقدار اسی قیمت سے خرید کی جاسکے۔ مثلاً فرض کیجئے ایک کوئنٹل گیہوں زکوٰۃ میں نکالنا ہے، جس روز زکوٰۃ واجب ہوئی، اس کی قیمت پانچ سو روپے ہوگی، مگر ادا کرنے میں تاخیر ہوئی اور جب زکوٰۃ ادا کی جائے تو اس کی قیمت بڑھ کر ایک ہزار روپے ہوگئی ہے تو اب اسے ایک ہزار روپے زکوٰۃ میں ادا کرنے ہوں گے(۱) یہی رائے فقہاء حنابلہ کی بھی ہے(۲) امام شافعیؒ سے مختلف رائیں نقل کی گئی ہیں، لیکن قولِ جدید جو آپ کی مشہور کتاب "الام" میں منقول ہے وہ یہ ہے کہ قیمت کے ذریعہ زکوٰۃ نکالی جائے گی۔(۳)

سال گذرنا

دوسرے اموالِ زکوٰۃ کی طرح سامانِ تجارت میں بھی احناف کے ہاں سال کی ابتدا اور اختتام پر "نصابِ زکوٰۃ" کا مکمل موجود ہونا کافی ہے۔ خواہ سال کے درمیان کسی وقت کم بھی ہو جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا(۴) اگر مال سال کے درمیان بالکل ہی ختم ہو جائے اور سونا چاندی یا روپیہ کا نصاب بھی اس کے پاس موجود نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور دوبارہ مالکِ نصاب ہونے کے بعد از سر نو سال گذرنے کا حساب کیا جائے گا، لیکن اگر کچھ سامان تجارت کا دوسرے تجارتی سامان سے تبادلہ کیا، جو تجارت میں عام طور پر ہوتا ہے تو اس کو مالِ تجارت کا ختم ہونا نہیں سمجھا جائے گا، اور نہ ہی از سر نو سال گذرنے کا انتظار ہی کیا جائے گا۔(۵)

سامانِ تجارت میں درمیانِ سال جو اضافہ ہو، احناف کے یہاں تو اصل کے ساتھ اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی ہی اور سال کا گذرنا ضروری نہیں ہوگا، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک بھی اس اضافہ پر سال کا گذرنا ضروری نہیں ـــــ البتہ شوافع کے ہاں اس اضافہ پر بھی سال گذرنا چاہئے۔(۶)

(۱) بدائع الصنائع ۲/۹۱ (۲) المغنی ۲/۳۳۷
(۳) حلیۃ العلماء ۳/۱۰۵ (۴) تاتار خانیہ ۲/۲۴۰
(۵) تاتار خانیہ ۲/۲۵۱ (۶) المغنی ۲/۳۳۹

شیئرز اور باؤنڈز میں زکوٰۃ

موجودہ زمانہ میں اسٹاک ایکس چینج سرمایہ کاری کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک صورت شیئرز کی ہے جس کو حصص کہا جاتا ہے، شیئرز ہولڈر کی حیثیت حصہ داروں کی ہوتی ہے، حصص کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، کمپنی فیل ہو جائے تو نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے، دوسری صورت باؤنڈز کی ہے، باؤنڈز کی حیثیت قرض کی سند کی ہے، گویا کمپنی اس کی مقروض ہوتی ہے، کمپنی کے نفع و نقصان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور ان کو اس پر سود بھی دیا جاتا ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ باؤنڈز کی حیثیت چوں کہ "دین قوی" کی ہے اس لیے اس پر تو بہر حال زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر سود کی رقم کو اصل کی رقم سے ممتاز کیا جانا ممکن نہ ہو تو پورے مال یعنی اصل اور سود کے مجموعے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، حصص چوں کہ تجارتی بھی ہو سکتے ہیں اور صنعتی بھی، شریعت کا اصول یہ ہے کہ سامانِ تجارت پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور آلاتِ صنعت پر واجب نہیں ہوتی، اس لیے اگر کمپنی تجارتی نوعیت کے کاروبار کرتی ہے تب تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور اگر صنعت میں اس رقم کو صرف کیا جائے جیسے اس کے ذریعے مشینیں وغیرہ لی گئی ہوں تو ایسی صورتوں میں اس سے حاصل ہونے والی آمدنی پر دوسرے اموالِ زکوٰۃ کے ساتھ مل کر زکوٰۃ واجب ہوگی، مشینیں اور صنعتی آلات کی صورت میں جو سرمایہ موجود ہے، اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔

مالِ مضاربت میں زکوٰۃ

مالِ تجارت کی زکوٰۃ میں ایک اہم اور قابلِ ذکر مسئلہ یہ ہے کہ (۱) مضاربت کی صورت میں کس اور کتنے سرمایہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی؟ اس پر تو اتفاق ہے کہ اصل سرمایہ (راس المال) اور مالک سرمایہ (رب المال) کے حصہ کے نفع کی زکوٰۃ خود ادا کرنی ہوگی، گو ابھی سلسلۂ کاروبار جاری ہو، لیکن دوسرا فریق (مضارب) اپنے حصہ نفع کی زکوٰۃ کب ادا کرے؟ اس میں اختلاف ہے۔ احناف کے ہاں معاملہ ختم ہونے سے پہلے ہی سال گذرنے کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب

---

(۱) ایک شخص کا سرمایہ ہو اور دوسرے کی محنت، اور جو نفع ہو وہ باہم طے شدہ تناسب کے ساتھ دونوں میں تقسیم ہو جائے اس کو "مضاربت" کہتے ہیں، سرمایہ کار کو "رب المال" محنت کرنے والے کو "مضارب" اور اصل سرمایہ کو "راس المال" کہا جاتا ہے۔

ہو جائے گی۔ حنابلہ کے ہاں مدّتِ کاروبار کے پورے ہونے اور نفع اور نقصان کا قطعی تصفیہ ہونے کے بعد ہی زکوٰۃ ادا کرے گا (۱) اس پر شوافع کے ہاں بھی عمل ہے۔ (۲)

جانوروں میں زکوٰۃ

اسلام کا سورج جس عہد میں اور جس سرزمین پر طلوع ہوا، وہاں نہ کاشت اور زراعت کے بڑے وسائل تھے، نہ تجارت اور کاروبار کی بڑی بڑی منڈیاں تھیں، وہاں سب سے بڑا ذریعہ معاش "مویشی" تھے، ان کا دودھ اور گوشت غذا کا سامان تھا، اور ان کی پشت بار برداری، سفر اور نقل و حرکت کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، انسانی آبادی کی کمی کی وجہ سے ان جانوروں کے لیے قدرتی چراگاہیں، بڑے بڑے صحراؤں اور ویرانوں کی صورت میں موجود تھیں، اس لیے ان کی افزائش میں اخراجات بھی کم ہوتے تھے، اس لیے ضروری تھا کہ مویشیوں میں بھی زکوٰۃ واجب قرار دی جاتی اور وضاحت و تفصیل کے ساتھ اس کے احکام بیان ہوتے۔

چنانچہ حدیث میں "اموالِ زکوٰۃ" میں سب سے زیادہ جس کے ذکر نے حصہ پایا ہے وہ غالباً یہی مویشی ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے خود اس کا نصاب مقرر فرمایا: زکوٰۃ کی مقدار متعین فرمائی اور زبانی اظہارِ خیال پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کو لکھوا کر اپنے گورنر کے سپرد فرمایا — اس میں نصاب اور مقدار تو مختلف جانوروں سے متعلق الگ الگ ہے، لیکن کچھ احکام ایسے ہیں جن میں تمام مویشی مشترک ہیں پہلے ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کن جانوروں میں زکوٰۃ واجب ہوگی؟

جانوروں کی زکوٰۃ میں پہلی بات جو قابلِ لحاظ ہے، وہ یہ ہے کہ ایسے جانور جو بار برداری اور نقل و حمل کے لیے ہوں، یا اس لیے کہ ان کو ذبح کر کے غذا بنانا ہے، ان پر زکوٰۃ واجب نہیں، اسی طرح جو جانور تجارتی مقصد کے لیے لیے گئے ہوں، ان میں گو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، مگر مالِ تجارت کی شرح سے اور مالِ تجارت ہونے کی حیثیت سے، مویشی میں مویشی کی حیثیت سے اور مویشی والی زکوٰۃ شرح سے جو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، وہ اس وقت کہ اس کی پرورش کا مقصود

---

(۱) المغنی ۳۱/۲-۳۴۰ (۲) دیکھیے: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۸۰۰/۲-۷۹۹

دودھ کا حصول اور افزائش نسل ہو۔(۱)

دوسری یہ کہ پورے سال یا کم سے کم سال کے بیشتر حصہ میں اس کے چارہ کا نظم مالک کو کرنا نہ پڑتا ہو، وہ عوامی چراگاہوں اور کھلے میدانوں سے چر کر اپنی ضرورت پوری کر لیتے ہوں(۲) تیسرے یہ کہ جانوروں کے نصاب میں ضروری ہے کہ ایک ہی نوع کے جانور کا مکمل نصاب ہو، مثلاً کچھ اونٹ ہوں اور کچھ بکریاں، تو دونوں کو ملا کر نصاب پورا نہیں کیا جائے گا، ہاں اس میں کوئی حرج نہیں کہ عمدگی کے اعتبار سے ان میں فرق ہو یا وہ مختلف علاقوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ زکوٰۃ کا ایسا جانور جو دو مختلف جنس کے جانوروں کے اختلاط سے پیدا ہوا ہو، اس میں ماں کا اعتبار ہوگا، مثلاً ہرن اور بکری کے اختلاط سے پیدا ہو تو بچہ بکری ہی کے حکم میں ہوگا اور اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی(۳) جانوروں میں نر ہوں یا مادہ، زکوٰۃ واجب ہونے میں حکم دونوں کا یکساں ہے۔(۴)

کس طرح کا جانور وصول کیا جائے؟

زکوٰۃ میں دینے کے لیے جس جانور کا انتخاب کیا جائے اس میں بھی دو باتوں کی رعایت کی جائے گی، اول اونٹ کی زکوٰۃ میں جنس کی، کہ جن صورتوں میں شریعت نے "مادہ" کو بہ طور زکوٰۃ واجب کیا ہے جیسے "بنت مخاض" یعنی ایک سالہ اونٹنی اور "بنت لبون" یعنی دو سالہ اونٹنی وغیرہ تو ان صورتوں میں اسی سن و سال کا جانور کافی ہوگا۔ سوائے اس کے کہ ایسے جانور کے موجود نہ ہونے کی صورت اس کی قیمت کا نر جانور دیا جائے گا۔ گائے اور بکری میں نر و مادہ دونوں برابر ہیں(۵) دوسرے اوصاف اور عمدگی اور معمولی پن کے اعتبار سے وہ درمیانہ اور اوسط درجہ کا ہو۔ بیت المال کے محصل زکوٰۃ کو چاہیے کہ نہ بہت اعلیٰ جانور کا انتخاب کرے نہ بالکل معمولی اور کمتر جانور کا۔(۶)

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/ ۳۰ (۲) مجمع الانہر ۱/ ۱۹۷
(۳) بدائع الصنائع ۲/ ۳۰ (۴) تاتارخانیہ ۲/ ۲۱۹
(۵) بدائع الصنائع ۲/ ۳۳ (۶) بدائع ۲/ ۳۳

اونٹ کا نصاب اور مقدار

جانوروں میں زکوٰۃ کا نصاب کیا ہوگا؟ ـــــــ اس سلسلے میں خود پیغمبر اسلام ﷺ نے "کتاب الصدقہ" املا کرائی اور یمن کے علاقہ نجران کے گورنر حضرت عمرو بن حزمؓ کے حوالہ فرمائی، (۱) تین قسم کے جانور ہیں جن میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اونٹ، گائے اور بکری، البتہ گھوڑے کے سلسلے میں اختلاف ہے اور دوسرے جانوروں میں اسی صورت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے کہ اس کی تجارت کی جائے۔ اس لحاظ سے اونٹ کے زکوٰۃ کی تفصیل یوں ہے:

۵ تا ۹	اونٹ	۱ - بکری
۱۰ تا ۱۴	اونٹ	۲ - بکری
۱۵ تا ۱۹	اونٹ	۳ - بکری
۲۰ تا ۲۴	اونٹ	۴ - بکری
۲۵ تا ۳۵	اونٹ	ایک سالہ اونٹنی (بنت مخاض)
۳۶ تا ۴۵	اونٹ	دو سالہ اونٹنی (بنت لبون)
۴۶ تا ۶۰	اونٹ	ایک تین سالہ اونٹنی (حقہ)
۶۱ تا ۷۵	اونٹ	ایک چار سالہ اونٹنی (جذعہ)
۷۶ تا ۹۰	اونٹ	دو دو سالہ اونٹنیاں
۹۱ تا ۱۲۰	اونٹ	دو تین سالہ اونٹنیاں (۲)

اس تعداد تک تو سب کا اتفاق ہے، لیکن اس سے آگے فقہا کے درمیان اختلاف ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک ۱۲۰ کے بعد ترتیب یوں ہوگی کہ مجموعی تعداد میں حساب کر کے ہر چالیس پر دو سالہ اور پچاس پر تین سالہ اونٹنیوں کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی(۳) احناف کے یہاں ۱۲۰ کے بعد پھر ابتدائی حساب کی طرف عود کرتے ہوئے پانچ پر ایک بکری، دس پر دو بکری وغیرہ واجب ہوگی، جس کی تفصیلات کتب فقہ میں موجود ہیں۔(۴)

---

(۱) اس نوشتہ نبوی ﷺ کی تفصیل کے لیے دیکھئے: الوثائق السیاسیۃ ۵-۱۰۳
(۲) ترمذی باب ما جاء فی زکوٰۃ الابل والغنم ۱/ ۱۳۵، ۱۳۶ (۳) بدائع الصنائع [illegible]

گائے

گائے بیل کا کم سے کم نصاب ۳۰ مویشی ہیں، یہی عام فقہا کی رائے ہے،(۱) زکوٰۃ کی تعداد کیا ہو؟ اس کو خود آپ ﷺ نے واضح فرمادیا کہ تیس پر دو سالہ بچھڑا یا بچھڑی اور چالیس پر ایک تین سالہ (۲) اس کے بعد فقہا کا عام نقطہ نظر یہ ہے کہ انسٹھ جانوروں تک یہی ایک تین سالہ بچھڑا یا بچھڑی واجب ہوگی، پھر ساٹھ پر دو سال کے دو بچھڑے، اس کے بعد ہر دس کے اضافہ پر اس ترتیب سے زکوٰۃ واجب ہوگی کہ تیس جانوروں پر دو سالہ بچھڑا اور چالیس جانوروں پر تین سالہ بچھڑا ادا کیا جائے گا(۳) —— گائے کی زکوٰۃ میں ایک نکتہ پر فقہاءؒ کے درمیان اختلاف ہے، اور وہ یہ کہ چالیس سے ساٹھ کے درمیان کی اضافی تعداد پر کیا زکوٰۃ کی مقررہ شرح کے لحاظ سے زکوٰۃ عائد کی جائیگی؟ اکثر فقہا کے نزدیک چالیس سے انسٹھ تک ایک تین سالہ بچھڑا واجب ہوگا، امام ابو حنیفہؒ سے گو اس سلسلے میں مختلف روایتیں منقول ہیں۔ مگر ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس اضافی تعداد پر بھی مقررہ شرح سے زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً اکتالیس گائے ہو تو چالیس پر ایک تین سالہ بچھڑا اور مزید ایک گائے پر تین سالہ بچھڑے کا چالیسواں حصہ۔(۴)

نیز دوسرے مسائل کی طرح زکوٰۃ کے احکام میں بھی بھینس کا وہی حکم ہے جو گائے کا۔(۵)

بکری

تیسرا جانور جس پر زکوٰۃ واجب قرار دی گئی ہے۔ بکریاں ہیں چالیس سے ایک سو بیس بکریوں تک ایک اور ایک سو اکیس سے دو سو تک دو بکریاں واجب ہوں گی، آگے ہر سو پر ایک بکری واجب ہوتی ہے، —— بکریوں کے سلسلے میں نصاب اور مقدار کی صراحت خود پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمائی ہے،(۶) اور اس پر فقہاء کا بھی اتفاق ہے۔(۷) —— بھیڑ اور دنبے

(۱) بدایۃ المجتہد ۱/۲۶۱ (۲) ترمذی عن ابن مسعودؓ ۱/۱۳۶ باب ما جاء فی زکوٰۃ البقر
(۳) بدایۃ المجتہد ۱/۲۶۱، تاتارخانیہ ۲/۲۲۲ (۴) تاتارخانیہ ۲/۲۲۲
(۵) بدائع الصنائع ۲/۳۰ (۶) ترمذی، باب ما جاء فی زکوٰۃ الابل والغنم، ابوداؤد، باب فی زکوٰۃ السائمۃ
(۷) بدایۃ المجتہد ۱/۲۶۳

بھی زکوٰۃ میں بکریوں کے حکم میں ہیں۔(۱)

گھوڑے

جانوروں میں گھوڑوں میں زکوٰۃ واجب ہونے اور نہ ہونے میں اختلاف ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جن گھوڑوں کی پرورش کا مدار مالک کی طرف سے فراہم کردہ چارہ پر ہو نہ کہ عوامی چراگاہوں یا کھلے میدانوں میں چرنے پر، ان میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اسی طرح سواری بار برداری اور جہاد کے لیے رکھے گئے گھوڑے میں بھی زکوٰۃ نہیں، نہ ایسی صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی جب صرف نر گھوڑے ہوں —— البتہ افزائش نسل کے لیے پالے گئے گھوڑے پر جن میں نر و مادہ دونوں موجود ہوں، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے اور دوسرے فقہاء نیز خود امام ابو حنیفہؒ کے تلامذہ قاضی ابو یوسفؒ و محمدؒ کا نقطہ نظر ہے کہ زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی(۲) کہ خود آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمان پر اس کے گھوڑے میں زکوٰۃ واجب نہیں، لیس علی المسلم صدقة فی عبده ولا فی فرسه (۳) امام ابو حنیفہؒ کے پیش نظر حضرت عمرؓ کا عمل ہے جن کے بارے میں روایت کیا جاتا ہے کہ آپؓ نے فی گھوڑا ایک دینار زکوٰۃ عائد کی تھی(۴) جس حدیث میں گھوڑے پر زکوٰۃ واجب ہونے کی نفی کی گئی ہے، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس سے ایسے گھوڑے مراد ہیں جو خاص جہاد فی سبیل اللہ کے لیے رکھے گئے ہوں، چنانچہ مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے پوچھا گیا، کیا گھوڑے پر زکوٰۃ واجب ہے؟ فرمایا: مجاہد فی سبیل اللہ کے گھوڑے میں زکوٰۃ نہیں۔(۵)

مچھلی اور جھینگے میں زکوٰۃ

آج کل مچھلی اور جھینگے وغیرہ کی باضابطہ افزائش کی جاتی ہے اور پھر انھیں فروخت کیا جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ ان اشیاء کا کیا حکم ہوگا اور ان میں زکوٰۃ ہوگی یا نہیں؟ احکام زکوٰۃ کی تفصیل پر نظر رکھی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اموالِ زکوٰۃ کا تعین عقل و قیاس پر مبنی نہیں ہے،

(۱) بدائع الصنائع ۲/۳۰ (۲) بدائع الصنائع ۲/۳۰
(۳) بخاری باب لیس علی المسلم فی فرسہ صدقۃ، مسلم باب لا زکوٰۃ علی المسلم فی عبدہ ولا فرسہ
(۴) دیکھیے: طحاوی، باب الخیل السائمۃ ہل فیہا صدقۃ ام لا، عمدۃ القاری ۹/۳۳ (۵) نصب الرایہ ...

بلکہ "تعبدی" امور میں سے ہے، غور کیا جائے کہ ایک شخص کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمت کے ضرورت سے زیادہ مکانات و اراضی موجود ہیں تو زکوٰۃ واجب نہیں۔ اسی طرح کی اور صورتیں ہیں جو زکوٰۃ کے احکام و مسائل میں موجود ہیں۔ پس اموالِ زکوٰۃ کی تعیین "تعبدی" امور میں سے ہے۔

اس سلسلے میں شریعت نے جو اصول مقرر کیا ہے وہ یہ ہے کہ اموالِ زکوٰۃ تین قسم کے ہیں: حیوانات، نباتات اور معدنیات، ظاہر ہے کہ مچھلیاں نباتات اور معدنیات کے ذیل میں نہیں آتیں، حیوانات ہی میں ان کا شمار ہے، اور حیوانات میں جن چیزوں کو اموالِ زکوٰۃ کے زمرہ میں رکھا گیا ہے۔ مچھلیاں ان میں سے نہیں ہیں، اس لیے مچھلیاں یا کوئی اور آبی جانور اصولی طور پر اموالِ زکوٰۃ میں نہیں آتا۔ البتہ اگر ان کو تجارتی مقصد کے لیے خرید کیا جائے تو مالِ تجارت کے اصول کے مطابق ڈھائی فی صد زکوٰۃ واجب ہوگی، اور تمام احکام وہی ہوں گے جو اموالِ تجارت کے ہیں۔

جانوروں میں شراکت کا اثر

جانوروں کی زکوٰۃ میں فقہا کے درمیان جن باتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، ان میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ "اشتراک" ان کی زکوٰۃ کے احکام پر اثر انداز ہوگا یا نہیں؟ دوسرے فقہا کے ہاں ہوگا امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نہیں ہوگا، اشتراک کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ہر جانور میں ملکیت کے اعتبار سے دو یا اس سے زیادہ مالکان کی شرکت ہو، دوسرے یہ کہ مختلف جانور ہوں تو مختلف لوگوں کی الگ الگ ملکیت، ان دونوں ہی صورتوں میں اگر چراگاہ (مسرح) باڑہ (مبیت) دودھ دوہنے کا برتن (محلب) پانی پینے کی جگہ (مشرب) اور اس سے جفتی کرنے والا نر (فحل) ایک ہو تو ملا کر زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً دو الگ الگ اشخاص کی بیس بیس بکریاں ہوں، تو ان کے مجموعہ پر ایک بکری واجب ہوگی، حالاں کہ انفرادی حیثیت میں ان میں سے کسی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اسی طرح اشخاص کی چالیس چالیس بکریاں مشترکہ ہیں ان میں سے ہر ایک پر ایک ایک بکری بہ طور زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے تھی لیکن اسی بکریوں کے اس مجموعے پر بھی ایک ہی بکری ادا کرنی ہوگی۔(۱)

(۱) المغنی ۲/۲۴۸ بعضوں نے چرواہا ایک ہونے کی بھی شرط لگائی ہے، حوالہ مذکور

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک چراگاہ یا ملکیت میں شرکت کا زکوٰۃ کے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا، بلکہ ہر شخص کو اپنی ملکیت میں موجود جانوروں کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔(۱)

کمپنی کی زکوٰۃ

یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ جانوروں کے علاوہ دوسرے اموالِ زکوٰۃ میں شرکت کا کیا اثر ہے؟ اس سلسلے میں امام احمدؒ سے ایک روایت ہے کہ ان میں بھی شرکت کا یہی حکم ہوگا مگر حنابلہ کے یہاں ترجیح اسی بات کو ہے کہ شرکت کا اثر صرف حیوانات میں ہوتا ہے(۲) امام شافعیؒ سے بھی مختلف اور متضاد رائیں نقل کی گئی ہیں۔ لیکن قولِ جدید کے مطابق شرکت کا اعتبار ہے اور اسی پر حضرات شوافع کے ہاں فتویٰ ہے(۳) بہ شرطیکہ یہ اشتراک کم سے کم ایک سال سے ہو، اور تمام شرکاء زکوٰۃ واجب ہونے کے اہل ہوں اور سب مسلمان ہوں، ان میں سے کوئی غیر مسلم نہ ہو۔(۴)

اس اصول پر شوافع رحمہم اللہ کے نزدیک "کاروباری کمپنی" پر تمام مالکان کی مشترکہ املاک پر اس اصول کے مطابق زکوٰۃ واجب ہوگی جس کا اوپر ذکر ہوا، احناف کے ہاں ہر شخص پر اپنی املاک کے مطابق ہی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

معدنیات کی زکوٰۃ

زکوٰۃ کے احکام کے ذیل میں فقہا نے اس بات پر بھی بحث کی ہے کہ "معدنیات" جو افراد و اشخاص کو دستیاب ہوں، ان میں جماعتی اور قومی حقوق کیا ہیں؟ —— اس سلسلے میں فقہا کے اندر خاصا اختلاف ہے، احناف کی آراء کا خلاصہ علامہ ابن ہمامؒ نے عمدہ تجزیہ کے ساتھ نقل کیا ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ، یہ پیداوار تین طرح کی ہیں، ایک وہ جو جامد ہوں اور پگھلائی اور ڈھالی جا سکتی ہوں، جیسے سونا، چاندی، لوہا، پیتل وغیرہ، دوسرے جو جامد ہوں اور مختلف سانچوں میں ڈھالی نہ جا سکتی ہوں جیسے سرمہ، چونا وغیرہ اور مختلف پتھر، یاقوت یا نمک،

(۱) بدائع الصنائع ۲/۲۹ (۲) المغنی ۲/۲۵۴
(۳) شرح مہذب ۵/۴۵۰ (۴) حوالہ مذکور ۳۳۲-۳۳

تیسرے وہ جو جامد نہ ہوں، سیال ہوں مثلاً پانی یا تیل وغیرہ، ان میں دوسری اور تیسری قسم کی زمین سے نکلنے والی چیزوں پر پوری ملکیت اور پورا استحقاق اس شخص کا ہے جس کی مملوکہ زمین میں یہ نکلی ہوں، غیر مملوکہ یعنی سرکاری اراضی میں بھی جو شخص ان کا کھوج لگا کر کھود نکالے وہی اس کا مالک ہوگا۔ اس سے بیت المال "اسلامی حکومت کے سرکاری خزانے" کا کوئی حق متعلق نہیں ہوگا۔ البتہ پہلی قسم کی کانوں میں مذکورہ دونوں قسم کی اراضی میں یعنی اراضی کسی کی نجی ہو یا غیر مملوکہ (سرکاری) ہو، معدن کا پانچواں حصہ حکومت کو دینا ہوگا اور امام ابو حنیفہؒ کے ہاں اس کی حیثیت زکوٰۃ کی نہیں، بلکہ مفتوحہ ممالک سے حاصل ہونے والی ثروت (غنیمت) کی ہے اس لیے اس کے مصارف میں بھی وہی عموم ہے جو خود مال غنیمت میں ہے اور اس پر سال کا گذرنا بھی ضروری نہیں۔(۱)

ہر چند کہ اس سلسلہ میں متعدد نکات ہیں جن میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے، مگر ان کا ذکر یہاں طوالت سے خالی نہ ہوگا، البتہ یہ ظاہر ہے کہ فی زمانہ بعض ایسی دھاتوں سے انسانیت آگاہ ہوئی ہے جو نہایت قیمتی اور قومی وملکی معیشت کے لیے اساس کا درجہ رکھتی ہیں، جیسے: پٹرول، گیس، کوئلہ اور خود فولاد کی پیداوار کی جدید تکنیک، اگر ان کو افراد و اشخاص کی ملکیت میں دے دیا جائے یا اس طرح کی دوسری معدنیات ذاتی املاک بن جائیں۔ تو نا قابل تصور معاشی عدم توازن پیدا ہو جائے گا اور جدید سائنسی اور صنعتی دنیا میں حکومت کے لیے قومی مفادات کا تحفظ دشوار ہو کر رہ جائے گا۔ ان حالات میں ائمہ اربعہ میں سب سے موزوں اور متوازن رائے وہ ہے جو حضرات مالکیہ نے اختیار کی ہے۔

خود مالکیہ کی رائے میں بھی اضطراب ہے، لیکن ان کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ سرکاری اراضی ہو یا افراد و اشخاص کی مملوکہ اراضی، بہر صورت نکلنے والی تمام معدنیات سرکاری حق متصور ہوں گی اور حکومت عوامی مصالح وضروریات میں ان کو صرف کریں گی۔(۲)

---

(۱) فتح القدیر ۲/۷۹-۱۷۸ نیز دیکھیے: بدائع الصنائع ۲/۶۸-۶۷ اور رحمۃ الامۃ ۱۰۷

(۲) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۷۷۸، فقہ الزکوۃ للقرضاوی ۱/۴۳۱ رحمۃ الامۃ ۱۰۷

سمندری معدنیات

رہ گئیں سمندر سے حاصل شدہ معدنیات مثلاً موتی، عنبر وغیرہ۔ تو ائمہ اربعہ متفق ہیں کہ وہ نکالنے والوں کی شخصی ملکیت متصور ہوگی، اس لیے کہ ان کی حیثیت آبی شکار کی ہے، مگر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے عنبر میں پانچواں حصہ وصول فرمایا ہے، گروہ محدثین کے سرخیل امام زہری نے موتی میں بھی یہی مقدار واجب قرار دی ہے، یہی رائے مشہور صوفی بزرگ حسن بصریؒ کی ہے اور ابن ہمامؒ نے اسی طرح کی ایک روایت حضرت عبد اللہ بن عباس سے بھی نقل کی ہے(۱) ـــــ اس لیے خیال ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں سمندر سے مفاد عامہ کی قیمتی معدنیات نکالی جانے لگیں تو بین قومی قانون اور معاہدات کے مطابق جس طرح سمندر کے مختلف حصے مختلف ملکوں کی ملکیت سمجھے جاتے ہیں، ان حصوں کی معدنی پیداوار بھی انھیں ممالک کی سرکاری املاک کی حیثیت سے "محفوظ" کی جاسکتی ہیں اور افراد اس سے استفادہ کریں تو اس میں ۵/۱ حصہ سرکار اپنے حق کے طور پر وصول کرسکتی ہے۔

دفینے

"دفینے" جو زمین میں دستیاب ہوں، اگر ان پر ایسی علامات ہوں جن سے اندازہ ہو کہ وہ مسلمانوں کے ہیں، تو ان کا حکم وہی ہے جو کسی گمشدہ شئی (لقطہ) کی دستیابی کا ہے کہ اگر وہ شخص جسے دفینہ ملا ہو خود ضرورت مند اور مستحق صدقہ ہے تو اپنے آپ پر خرچ کرلے ورنہ دوسرے فقراء کو دیدے یا روکے رکھے تا آنکہ اس کا مالک وحقدار دریافت ہو جائے، ورنہ تو پانچواں حصہ حکومت کو ادا کرے اور باقی خود اس کی ملکیت ہوگی،(۲) احناف اور اکثر فقہا کی رائے ہے کہ دفینہ کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو؟ اور وہ کسی بھی چیز کا ہو جیسے سونا، چاندی، لوہا، سیسہ، تانبہ، پیتل اور برتن وغیرہ، سب کا حکم یہی ہے، البتہ امام شافعیؒ کے ہاں صرف سونے چاندی کے دفینے میں یہ پانچواں حصہ حکومت کو دینا واجب ہے اور وہ بھی اس وقت کہ سونا چاندی کے مقررہ نصاب کے مطابق ہو ورنہ نہیں۔(۳)

---

(۱) المغنی ۲/۳۳۳ فتح القدیر ۲/۱۸۵ (۲) ہدایہ مع الفتح ۲/۸۲-۱۸۱

(۳) دیکھیے: المغنی ۲/۲۹-۳۲۸

عشر

شریعت نے جن اموال میں زکوۃ واجب قرار دی ہے، ان میں ایک زمین کی پیداوار بھی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ : اے اہل ایمان! اپنی پاک کمائیوں اور زمین کی پیداوار سے خرچ کرو، (بقرہ ۲۶۷) ایک موقع پر فرمایا گیا کہ کھیتی کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔ **واتوا حقه یوم حصاده** (الانعام: ۱۴۱) حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ زکوۃ ہی کو اس آیت کا مصداق قرار دیتے تھے، (۱) حضور ﷺ سے منقول ہے کہ بارش اور چشمہ کے پانی سے (قدرتی ذرائع سے) سیراب ہونے والی کھیتی میں عشر (۱/۱۰) اور سیراب کی جانے والی کھیتی میں یعنی جس زمین کی سینچائی اور آبیاری مالک اراضی اپنی محنت سے کرے، بیسواں حصہ واجب ہے، (۲) چنانچہ گیہوں، جو، کھجور اور کشمش میں عشر واجب ہونے پر اتفاق ہے۔ (۳)

زکوٰۃ اور عشر کا فرق

دوسرے اموال کی زکوۃ اور زرعی پیداوار کی زکوۃ یعنی عشر کے درمیان فقہا نے ایک گونہ فرق کیا ہے، زکوۃ کو خالص عبادت مانا گیا ہے اور عشر میں ایک پہلو زمینی ٹیکس کا بھی ہے، اس لیے زکوۃ انہی لوگوں پر واجب ہوتی ہے، جو عاقل و بالغ ہوں، عشر نابالغوں اور فاتر العقل لوگوں کی زمین کی پیداوار میں بھی واجب ہے اور مالک زمین فوت ہو جائے پھر بھی عشر واجب رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اراضی وقف کی پیداوار میں بھی واجب ہوتا ہے، (۴) زمین کے ذیل میں بیان کیا جا چکا ہے کہ وقف شدہ املاک کی آمدنی پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی، اس کے برعکس وقف شدہ اراضی کی پیداوار میں عشر واجب ہوتا ہے، زکوۃ ایسے مال میں واجب ہوتی ہے جس میں نمو اور افزائش کی صلاحیت ہو، چاہے عملاً افزائش ہو یا نہ ہو، جیسے سونا، چاندی، سامانِ تجارت وغیرہ، لیکن "عشر" کا واجب ہونا زمین کے عملاً پیداوار دینے پر موقوف ہے، اگر پیداوار نہ ہو یا کھیتی نہ کی جائے تو عشر واجب نہ ہوگا (۵) ـــــ عشر واجب ہونے کے لیے زمین کا مالک ہونا ضروری نہیں، دوسرے کی مملوکہ زمین بھی کسی طرح حاصل کی اور کھیتی کی تو پیداوار میں بھی عشر واجب

(۱) المغنی ۲/۲۹۳ (۲) بخاری عن ابن عمر حدیث نمبر : ۱۴۸۳
(۳) المغنی ۲/۲۹۳ (۴) بدائع الصنائع ۲/۵۶ البحر الرائق ۲/۲۳۶
(۵) بدائع الصنائع ۲/۵۴

ہوگا (۱) افتادہ زمین جو کسی کی ملکیت نہ ہو (سرکاری زمین) اس پر کاشت کی جائے تو اس کی پیداوار پر بھی واجب ہوگا۔

کس پیداوار میں عشر ہے؟

فقہاء احناف اور دوسرے فقہاء کے درمیان عشر کے مسئلہ میں تین اہم نکات پر اختلاف ہے، ایک یہ کہ کس قسم کی پیداوار میں عشر واجب ہوگا؟ دوسرے کتنی مقدار میں واجب ہوگا؟ اور تیسرے کس زمین کی پیداوار میں واجب ہوگا؟

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک زمین کی ایسی تمام پیداوار جو بالقصد اگائی جاتی ہے (یعنی جو خود رونہ ہو) اس میں عشر واجب ہوگا، گھانس، بانس اور لکڑی کو اسی لیے مستثنی کیا گیا ہے کہ ان کی خاص طور پر کاشت نہیں کی جاتی، (۲) لیکن ظاہر ہے مختلف زمانوں اور ادوار کے فرق کو اس میں ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا، گھاس اور بانس کی فی زمانہ باضابطہ کاشت ہوتی ہے، بعض درختوں کی لکڑی کے لیے کاشت کی جاتی ہے اور وہ بہت کم مدت میں تناور اور قابل استفادہ ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں ضروری ہوگا کہ ان میں بھی عشر کو واجب قرار دیا جائے گا، یہی وجہ ہے کہ فقہانے ایک طرف بانس کو عشر سے مستثنی رکھا ہے، لیکن دوسری طرف یہ بھی کہا ہے کہ اگر یہ صرف کھیت کے کناروں پر نہ ہوں، بلکہ ان کی کھیتی کی جائے، تو پھر اس میں بھی عشر واجب ہوگا (۳)۔

ایسے درخت کہ ان کا پھل مقصود ہوتا ہے، جیسے کھجور وغیرہ کے درخت، ان کی حیثیت زمین کے تابع اور اس کے ایک حصہ کی ہے، اس لیے خود ان درختوں میں عشر واجب نہیں، اسی طرح درختوں سے جو گوند نکلتے ہیں، ان میں بھی عشر نہیں ہے، اس لیے کہ بقول علامہ ابن نجیم مصریؒ وہ شجر کاری کا مقصود نہیں (۴) لیکن ظاہر ہے کہ اگر کچھ درخت خاص گوند ہی کے حصول کے لیے لگائے جائیں یا ان سے ربر کی پیداوار ہوتی ہو، عطر و خوشبو کشید کی جاتی ہو، جیسے "صندل" ہے تو ایسی صورت میں اس کو "بے مقصد" قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ اور اس میں بھی عشر واجب ہوگا ـــــ عشر واجب ہونے کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ خوردنی چیز ہو۔

(۱) البحر الرائق ۲/۲۳۷ (۲) ہدایہ مع الفتح ۲/۱۸۶ البحر الرائق ۲/۲۳۷
(۳) تاتارخانیہ ۲/۳۲۴ (۴) البحر الرائق ۲/۲۳۸

ہو، کسی اور طور پر استعمال ہوتی ہو پھر بھی عشر واجب ہو سکتا ہے چنانچہ روئی اور گلاب کے پھول میں بھی عشر واجب ہے۔(۱)

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک شہد میں بھی عشر ہے اور اس سلسلے میں ان کے پیش نظر حضور ﷺ کا قول وعمل ہے، آپ ﷺ نے جب اہل یمن کو خط لکھا اور اس میں زکوۃ وغیرہ سے متعلق ہدایات دیں تو من جملہ اور ہدایت کے یہ بھی تھی کہ شہد والوں سے عشر وصول کیا جائے، نیز حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے خود بھی عشر وصول فرمایا ہے۔(۲)

حنابلہ کے ہاں عشر انہی پیداواروں میں ہے جو دیرپا ہوں اور خشک کی جا سکتی ہوں،(۳) شوافع کے ہاں ضروری ہے کہ قابل ذخیرہ اور دیرپا نیز خوردنی ہو، چنانچہ پھلوں میں ان کے ہاں صرف کھجور اور انگور ہی میں عشر واجب ہوگا،(۴) مالکیہ کے ہاں بھی کھجور، کشمش اور زیتون میں ہی عشر واجب ہوتا ہے،(۵) خود احناف میں امام ابو یوسفؒ وامام محمدؒ کے ہاں بھی ایسی ہی پیداوار میں عشر واجب ہوتا ہے، جو دیرپا ہوں ان کی منفعت عام ہو اور ان کی کاشت بذات خود مقصود ہو،(۶) گویا، اجناس گیہوں، چاول اور اس طرح کے دوسرے اناج میں عشر واجب ہونے پر سبھوں کا اتفاق ہے، البتہ سبزیوں، ترکاریوں، موسمی پھلوں اور بہ عجلت خراب ہو جانے والی چیزوں میں عشر واجب ہوگا یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، عام فقہاء کے نزدیک ان میں عشر واجب نہیں، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ان میں بھی عشر ہے، امام صاحب کے پیش نظر وہ حدیث ہے کہ زمین سے جو بھی پیدا ہو اس میں عشر ہے(۷) اس میں آپ ﷺ نے دیرپا ہونے اور نہ ہونے کی کوئی قید نہیں لگائی ہے ارر دوسرے فقہاء کے پیش نظر یہ فرمان نبوی ﷺ ہے کہ سبزیوں میں زکوۃ نہیں لیس فی الخضروات صدقة.(۸)

---

(۱) فتاویٰ قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ۲۷۶/۱

(۲) حدیث کی حیثیت کے لیے دیکھیے: فتح القدیر علی الہندیہ ۱۹۱/۲

(۳) المغنی ۲۹۳/۲ (۴) شرح مہذب ۴۵۱/۲

(۵) الشرح الصغیر ۶۰۸/۱ (۶) تاتارخانیہ ۳۶۳/۲ کتاب العشر

(۷) بخاری عن ابن عمر ۲۰۱/۱ باب العشر فیما یسقی من ماء الخ

(۸) ترمذی عن معاذ بن جبل ۱۳۸/۱ باب ماجاء فی زکوۃ الخضروات

عشر کا نصاب

امام ابو حنیفہؒ کے ہاں عشر واجب ہونے کے لیے کوئی "نصاب" نہیں ہے کم وبیش جو بھی پیداوار ہو، عشر بہر حال واجب ہوگا،(۱) یہاں بھی امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ کے بہ شمول قریب قریب تمام ہی فقہا کی رائے امام صاحبؒ سے مختلف ہے، ان حضرات کے ہاں کم سے کم پانچ "وسق" پیداوار ہو، تب عشر واجب ہوگا، یہ پانچ وسق جدید اوزان کے لحاظ سے ۶۵۳ کلو گرام ہوتا ہے،(۲) اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: دانا اور پھل میں زکوۃ نہیں، تا آنکہ ان کی مقدار پانچ وسق ہو جائے،(۳) امام صاحب نے اوپر جو حدیث گذری ہے، اس کے عموم کو سامنے رکھا ہے، کہ آپ ﷺ نے کسی نصاب ومقدار کی تحدید کے بغیر عشر واجب قرار دیا ہے۔

عشری زمینیں

اکثر فقہا نے "عشر" کو زکوۃ کی طرح مانا ہے اور جیسے مسلمان پر اس کے مال میں زکوۃ واجب ہے، خواہ وہ اسلامی ملک میں ہو یا کسی اور علاقہ کا باشندہ ہو، اسی طرح کوئی بھی زمین ہو، اگر مسلمان اس کی پیداوار کا مالک ہے تو اس میں عشر واجب قرار دیا ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ کہ زمینیں دو قسم کی ہیں، عشری اور خراجی، عشری زمینیں یہ ہیں۔

۱ - جزیرۃ العرب کی پوری زمین عشری ہے اور یہ علاقہ غدیب سے مکہ اور عدن ابین سے اقصاء حجر (یمن) تک کا ہے۔

۲ - وہ اراضی جس کے مالکین اپنی رغبت سے مسلمان ہو گئے ہوں۔

۳ - ان علاقوں کی اراضی جو بذریعہ جنگ فتح کے گئے اور فرماں روائے اسلام نے ان کو مسلمان مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔

۴ - مسلمانوں کے مکانات کی یا دوسری غیر زرعی اراضی جس کو کھیت یا باغ بنا دیا گیا اور وہ عشری پانی سے سیراب کی جاتی ہوں۔

۵ - افتادہ زمین جس کو فرماں روائے اسلام کی اجازت سے مسلمانوں نے آباد کیا ہو اور وہ عشری زمین کے پڑوس میں ہو۔

---

(۱) ہدایہ مع الفتح ۱۸۶/۲ (۲) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۸۰۳/۲

(۳) نسائی عن [illegible] الخدری ۲۶۷/۱، باب زکوۃ الحبوب

یہ صورتیں خراجی زمینوں کی ہیں۔

۱ - جو علاقے بہ قوت فتح کیے گئے اور مسلم فرماں روانے وہ اراضی غیر مسلموں کے قبضہ میں رہنے دیں۔

۲ - افتادہ زمین جسے گو مسلمان نے آباد کیا ہو، مگر وہ خراجی زمین کے پڑوس میں ہو۔

۳ - افتادہ زمین، جسے غیر مسلم نے مسلمان حکومت کی اجازت سے آباد کیا ہو۔

۴ - جو زمین مسلم حکومت نے اپنے معاون غیر مسلم فوجیوں کو انعام میں دی ہو۔

۵ - غیر مسلموں کے مکانات کی زمین جن کو باغ یا کھیت بنادیا گیا ہو۔(۱)

افتادہ زمین کے آباد کرنے میں امام محمدؒ نے عشری اور خراجی پانی کا فرق کیا ہے کہ اگر وہ زمین عشری پانی سے سیراب ہوتی ہو تو عشر واجب ہے ــــ اور خراجی پانی سے سیراب تو خراج، عشری پانی سے مراد عشری زمین کے کنوؤں یا چشموں بارش اور سمندر کے پانی سے سیراب کرنا ہے۔(۲)

امام ابو حنیفہؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ غیر مسلم عشری زمین خرید کرلیں تو ان پر "خراج" واجب ہوگا، اس لیے کہ عشر عبادت ہے، اور عبادت مسلمانوں ہی کی معتبر ہے، لیکن اگر مسلمان نے "خراجی" زمین خرید کرلی تو عشر کی بجائے اس پر خراج ہی واجب ہوگا اور مالک کے بدلنے سے وہ "عشری" نہ ہوگی والارض اذا صارت خراجية لاتنقلب عشرية بتبدل المالك (۳) لیکن دوسرے فقہاء کی رائے میں مسلمانوں کو اس میں "عشر" ادا کرنا ہے۔

ہندوستان کی اراضی کا حکم

اس پس منظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان مالکان اراضی پر عشر ادا کرنا واجب ہے یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ ایک تو ہر زمین کے بارے میں یہ تحقیق مشکل ہے کہ ان زمینوں کی اصل کیا ہے؟ یعنی مسلم عہد حکومت میں یہ زمین مسلمانوں کو دی گئی تھی یا غیر مسلموں کو؟ دوسرے انگریزوں کے تسلط کے بعد ہندوستان کی حیثیت دار الحرب کی ہو گئی تھی اور دار الحرب کے بارے میں شامی نے لکھا ہے کہ وہاں کی زمین نہ خراجی ہے اور نہ

(۱) بدائع الصنائع ۵۸/۲   (۲) تاتارخانیہ ۳۳۶/۲

(۳) بدائع الصنائع ۵۷/۲

عشری، فان ارضها ليست ارض خراج وعشر. (۱) اس کا تقاضا ہے کہ یہاں کی اراضی کی پیداوار پر عشر واجب نہ ہو۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی زمین پر عشر واجب ہونا چاہیے اس لیے کہ :

۱ - اول تو اصل مسلمانوں کی زمین کا عشری ہوناہی ہے، اسی لیے فقہا نے پہاڑ وغیرہ کے پھلوں پر بھی عشر واجب قرار دیا ہے اور ابن نجیم نے سرخسی سے نقل کیا ہے کہ: ان عليه العشر بكل حال لانه احق بالعشر من الخراج. (۲)

۲ - دوسرے یہی اکثر فقہا کی رائے ہے۔

۳ - تیسرے یہی کتاب اللہ اور احادیث نبوی میں پیداوار کی زکوۃ کے عمومی حکم کا بظاہر تقاضا ہے۔

۴ - اس میں احتیاط اور فقراء کا نفع ہے۔

۵ - فقہا احناف نے اس فرق کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ عشر و خراج کا اجتماع لازم نہ آجائے اور اسلامی حکومت کے مفقود ہونے کی وجہ سے یہاں خراج کا حکم نہیں، تو اب عشر و خراج کے اجتماع کا بھی سوال نہیں رہا۔

رہ گیا دار الحرب کی زمینوں میں عشر کا واجب نہ ہونا، تو حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نے فقہی تصریحات کو سامنے رکھ کر جو تطبیق پیدا کی ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے دار الحرب کے کافر حربیوں کی زمین مراد ہے نہ کہ مسلمانوں کی، چنانچہ خود امام ابو یوسفؒ کی عبارتوں سے دار الحرب کے مسلمانوں پر زکوۃ کے وجوب اور سرخسی کے ہاں کافر حربیوں کے زمین کے عشری نہ ہونے کی صراحت معلوم ہوتی ہے، امام ابو یوسفؒ دار الحرب کے مسلمانوں کے بارے میں فرماتے ہے :

فان دماء هم حرام وما اسلموا عليه من اموالهم وكذالك ارضوهم لهم وهي ارض عشر. (۳)

ان کا خون حرام ہے اور جب وہ مسلمان ہیں تو ان کا مال بھی، ان کی زمین

(۱) ردالمحتار ۵۹/۲   (۲) البحر الرائق ۲۳۹/۲

(۳) کتاب الخراج ۵۳

بھی انہی کی ہے اور یہ زمین عشری ہو گی۔

اور امام سرخسی حربی کافروں کی زمین کے عشری نہ ہونے کے متعلق رقمطراز ہیں :

واراضی اهل الحرب ليست بعشرية ولا خراجية .(۱)

اس سلسلے میں حضرت مولانا عبدالصمد صاحب نے پوری تحقیق و تنقیح کے بعد ہندوستان کی مختلف اراضی کی تیرہ صورتیں مقرر فرمائی ہیں اور دس پر اصولاً اور تین پر احتیاطاً عشر کا حکم لگایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

اگر مسلمانوں کی زمینوں پر غور کیا جائے تو حسب ذیل صورتیں نکلتی ہیں۔

۱ - بادشاہان اسلام کے وقت سے موروثی ہیں۔

۲ - بادشاہان اسلام کے وقت سے موقوفہ ہیں۔

۳ - موروثی زمینیں ہیں، مگر شاہی وقت سے نہیں، مگر یہ بھی معلوم نہیں کہ کیوں کر قبضہ میں آگئی ہیں۔

۴ - جو زمینیں مسلمانوں نے خریدی ہیں یا بطریق ہبہ یا بذریعہ وصیت ان کو ملی ہیں اور جس نے فروخت کیا یا ہبہ کیا یا وصیت کی، اس نے بھی کسی مسلمان ہی سے حاصل کی تھی، اسی طرح برابر سلسلہ جاری رہا ہے۔

۵ - جو زمین مسلمانوں کے قبضہ میں وراثتاً یا خرید و فروخت کے ذریعہ سے ہے لیکن اوپر کا حال معلوم نہیں کہ پہلے کے لوگوں نے کس طرح حاصل کیا تھا۔

۶ - جو زمین مسلمانوں کے قبضہ میں مسلمانوں سے خرید و فروخت کے ذریعہ سے آئی ہے اور اوپر جا کر یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ اسلام نے دی تھی۔

۷ - انگریزی حکومت نے بہ طور معافی اس زمین کو دیا جو پہلے کبھی مسلمانوں کی ملکیت تھی۔

۸ - انگریزی حکومت نے مسلمانوں کو بہ طریق معافی زمین دی، مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ زمین پہلے کس کی تھی؟

۹ - مسلمانوں نے غیر مزروعہ زمین کو جو کسی کے قبضہ میں نہ تھی، آباد کیا ہے اور وہ عشری زمین کے قریب ہے یا آسمانی و دریائی پانی یا کنوئیں سے سیراب ہوتی ہے۔

۱۰ - مسلمانوں نے اپنے سکونتی مکانات کو مزروعہ بنایا اور اس کی سیرابی عشری پانی سے ہوئی

(۱) شرح السیر الکبیر ۴/ ۲۰۳

یا بنا بر قول بعض کسی پانی سے سیراب ہوئی ہو۔

۱۱ - مسلمانوں نے مسلمانوں سے خریدی ہے لیکن بیچنے والے نے غیر مسلم سے خرید کیا تھا۔

۱۲ - مسلمانوں نے غیر مسلم سے خرید کیا ہے۔

۱۳ - انگریزی حکومت نے مسلمانوں کو وہ زمین بہ طور معافی دی جو کسی غیر مسلم کی ملکیت تھی۔

ان تیرہ صورتوں میں پہلی دس صورتوں میں سب زمین عشری ہے ——— اور صرف تین صورتیں ایسی ہیں کہ جن میں فقہاء حنفیہ کے اصول سے وہ زمین خراجی ہے لیکن ان تمام تفصیلات سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی زمین کے خراجی ہونے کی بہت کم صورتیں ہیں اور ان کی تحقیق بھی نہایت مشکل ہے اس لیے ظاہر حال کا لحاظ کر کے مسلمانوں کو احتیاط کے مسلک پر تمام زمینوں کی پیداوار میں عشر نکالنا چاہیے۔(۱)

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی، مفتی دارالعلوم دیوبند سے گو اس سلسلے مختلف قسم کے فتاویٰ منقول ہیں، لیکن مختلف فتاویٰ کو سامنے رکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداء آپ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی وجہ سے یہاں کی اراضی میں عشر واجب ہونے کے قائل نہیں تھے، لیکن بعد کو آپ کی رائے بھی ہندستانی اراضی کے عشری ہونے ہی کی ہو گئی تھی، آپ کے کئی فتاویٰ میں اس نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے، لیکن بعد کو آپ نے شامی کی ایک طویل عبارت سے استفادہ کرتے ہوئے اس مسئلہ پر اصولی بحث کی ہے، اس فتوے کے چند فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

"ان عبارات سے چند امور معلوم ہوئے ایک یہ کہ مسلمان کی آراضی کا اصل وظیفہ عشر ہے، دوم یہ کہ اگر بادشاہ عشر نہ لیوے تو عشر ساقط نہیں ہوتا بلکہ خود مالک زمین کو عشر نکالنا چاہئیے سوم یہ کہ عشر بھی زکوۃ ہے پس جب کہ اصل وظیفہ مسلم کا عشر ہے، تو جو آراضی مملوکہ مسلمین ہیں تو یا اصل میں عشری تھی کہ سلاطین اہل اسلام نے ان کو فتح کر کے مسلمانوں کو دی تھی یا ان کا حال سابق کچھ معلوم نہیں ان دونوں صورتوں میں ہی عشر لازم ہے الاصل احوط یہی ہے کہ مسلمان اپنی اراضی کی پیداوار

(۱) کتاب العشر والزکوۃ ، ص : ۶۰-۱۵۹

زمین سے عشر ادا کریں"(۱)

اسی طرح کی آراء دوسرے علماء محققین حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، (۲) اور حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی، (۳) وغیرہ سے بھی منقول ہے۔ اور اس وقت ہندوستان میں بالعموم اسی پر فتویٰ ہے اور یہی حق ہے۔ افسوس کہ اول تو مسلمانوں کی زکوٰۃ کی طرف توجہ ہی نہیں اور زیورات اور مال تجارت کی زکوٰۃ نکال بھی لیں تو عشر کی فرضیت کا احساس نہیں۔

والی اللہ المشتکی

عشر کی مقدار

عشر کی مقدار خود رسول اللہ ﷺ نے متعین فرمادی ہے، وہ زمین جس کی پورے سال یا سال کے اکثر حصہ میں قدرتی پانی سے آبیاری ہوتی ہو، اور سیراب نہ کرنا پڑتا ہو، اس میں دسواں حصہ عشر ہوگا اور جس زمین کو پورے سال یا اکثر حصہ اپنی محنت سے سیراب کرنا پڑتا ہو، اس میں بیسواں حصہ ادا کرنا ہوگا۔ (۴) —— البتہ کھیتی پر جو دوسرے اخراجات ہل، بیل، مزدوری حفاظت و نگرانی وغیرہ کے آئے ہوں وہ منہا نہیں کئے جائیں گے، (۵) دَین بھی اس زکوٰۃ سے منہا نہیں کیا جائے گا، پیداوار کی مذکورہ مقدار بہر حال ادا کرنی ہوگی۔ (۶)

متفرق ضروری احکام

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دانہ نکلنے اور پھل کے ظاہر ہونے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تیار ہونے اور امام محمدؒ کے نزدیک کاٹنے اور توڑے جانے کے وقت عشر واجب ہوتا ہے، (۷) تاہم اس اختلاف کا اثر اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کہ عشر کے لیے بھی نصاب مانا جائے، اگر امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے مطابق کوئی نصاب مقرر نہ ہو تو کوئی بڑا فرق واقع نہ ہوگا، عشر نکالنے کے بعد ہی پیداوار استعمال کرنی چاہیے **ولا یاکل من طعام العشر حتی یؤدی** (۸)

---

(۱) فتاوی دارالعلوم دیوبند، مرتبہ مفتی ظفیر الدین صدیقی ۶/۸۹-۱۸۸
(۲) امداد الفتاوی ۲/۶۰ ترتیب مفتی محمد شفیع صاحب (۳) علم الفقہ
(۴) ابن ماجہ عن ابی ہریرہ ۱/۱۳۰ باب صدقۃ الزروع والثمار
(۵) بدائع الصنائع ۲/۶۲ (۶) بدائع ۲/۵۷
(۷) بدائع الصنائع ۲/۶۳ (۸) در مختار علی حاشیہ الرد ۲/۵۳

اگر عشر واجب ہونے کے بعد لیکن نکالنے سے قبل بلا ارادہ پیداوار ضائع ہو جائے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عشر معاف ہو جائے گا۔ امام شافعیؒ کے یہاں واجب ہوگا، جان بوجھ کر ضائع کردے تو بالاتفاق عشر واجب رہے گا۔ (۱)

کھیت بونے سے پہلے ہی عشر ادا کردے تو بالاتفاق عشر ادا نہ ہوگا۔ دانے اُگ آنے کے بعد عشر ادا کردے تو بالاتفاق ادا ہو جائے گا۔ بونے کے بعد اور اُگنے سے پہلے ادا کیا جائے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ادا ہوگا اور امام محمدؒ کے نزدیک ادا نہیں ہوگا، (۲) پھل نکل آنے کے بعد اگر اس کا عشر پیشگی ادا کردیا جائے تو بالاتفاق کافی ہے، (۳) جس پر عشر واجب تھا اس کی موت واقع ہوگئی تو عشر ساقط نہ ہوگا، چاہے اس کے ادا کرنے کی وصیت کی ہو یا نہ کی ہو بہر حال ادا کیا جائے گا، (۴) عشری زمین تجارت کے لیے خرید کی اور اس سے پیداوار حاصل کی تو پیداوار میں عشر واجب ہوگا، تجارت والی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ (۵)

زمین بٹائی پر دی گئی ہے تو مالک زمین اور کاشت کار اپنے اپنے حصہ پیداوار میں عشر ادا کریں گے، (۶) اسی طرح کھیتی پکنے کے بعد زمین مع کھیت یا صرف کھیتی فروخت کردی تو بیچنے والے پر عشر واجب ہوگا، (۷) اگر زمین کرایہ وپٹہ پر دیدی تو امام ابو حنیفہؒ کے ہاں اصل مالک زمین پر اور ابو یوسفؒ و محمدؒ کے نزدیک کرایہ دار پر عشر ہوگا۔ بعض لوگوں نے امام صاحب اور بعضوں نے صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا ہے، شامی کا رجحان صاحبین کی رائے کی طرف ہے، (۸) اور غالباً یہی زیادہ درست ہے کہ کرایہ دار کو عشر ادا کرنا چاہیے۔

زکوٰۃ کی دوسری اقسام کے جو مصارف ہیں وہی مصارف عشر کے بھی ہیں اور زکوٰۃ ہی کی طرح عشر میں بھی تملیک یعنی کسی انسان کو مالک بنانا ضروری ہے، تعمیر مساجد پر اس کو صرف نہیں کیا جاسکتا۔ (۹)

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۶۵ (۲) حوالہ سابق ۵۴
(۳) حوالہ سابق (۴) تاتارخانیہ ۲/۳۳۹
(۵) تاتارخانیہ ۲/۳۳۹ (۶) بدائع الصنائع ۲/۵۷-۵۶
(۷) بدائع الصنائع ۲/۵۷-۵۶ (۸) ردالمحتار ۲/۵۵
(۹) بدائع الصنائع ۲/۶۵-۶۴

مقدارِ زکوٰۃ کی حکمت

شریعت نے زکوٰۃ کو جن مالوں میں واجب قرار دیا ہے اور اس کے لیے جو مقدار متعین کی ہے، ہماری ناقص عقل بھی اس کی حکمت اور مصلحت سمجھ سکتی ہے، پھل اور زمینی پیداوار اونٹ، گائے اور بکری یہ اشیائے خوردنی ہیں، اور فقرا اور محتاجوں کی سب سے بڑی ضرورت کو پوری کرتے ہیں۔ سونا چاندی سرمایہ کے حصول اور تبادلہ کا اہم ذریعہ ہے اور یہی حال سامانِ تجارت کا ہے، اس لیے ان اشیا میں زکوٰۃ واجب قرار دی گئی ہے ـــــ ایسی جائداد جس میں نمو اور بڑھوتری نہ ہو، جیسے کاشت کی اراضی، مکانات، صنعتی آلات اور مشینیں، ان میں خود کوئی زکوٰۃ نہیں رکھی گئی ہے، بلکہ ان سے حاصل ہونے والی آمدنی پر دوسرے اموالِ زکوٰۃ کے ساتھ مل کر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

پھر سب سے زیادہ مقدار میں دفینوں اور حاصل شدہ کانوں میں زکوٰۃ مقرر کی گئی ہے، یعنی بیس فی صد، اس لیے کہ ان اموال کے حاصل ہونے میں صاحب سرمایہ کو کوئی محنت نہیں کرنی ہوتی، اس کے بعد دس فی صد زکوٰۃ آسمانی پانی کے ذریعہ حاصل ہونے والی زمینی پیداوار میں رکھی گئی ہے۔ پھر اس میں دفینوں اور کانوں کے ذریعہ حاصل ہونے والی دولت کے مقابلہ کم محنت کرنی ہوتی ہے، لیکن اگر خود زمین کو سینچنا پڑا ہو تو چونکہ کھیتی کا صرفہ بڑھ جاتا اور محنت بھی۔ اس لیے پانچ فی صد زکوٰۃ نکالنی ہوگی بہ نسبت دوسرے ذرائع معاش کے، تجارت میں محنت و مشقت زیادہ ہے اور وقت بھی زیادہ صرف کرنا ہوتا ہے، اسفار کی نوبت بھی زیادہ آتی ہے اور نقصان کا بھی احتمال ہوتا ہے اس لیے اس میں سب سے کم یعنی ڈھائی فی صد زکوٰۃ مقرر کی گئی ہے، اور یہی بات سونے اور چاندی میں بھی پائی جاتی ہے، نیز سونے اور چاندی گردش میں نہ ہوں، اور منجمد شکل میں رکھا ہوا ہو پھر بھی اس میں زکوٰۃ واجب کی گئی ہے، ان باتوں کی رعایت کرتے ہوئے اس میں بھی ڈھائی فی صد ہی زکوٰۃ رکھی گئی ہے۔

مویشیوں میں جن کے اندر افزائشِ نسل کم ہوتی ہے ان میں تو زکوٰۃ بالکل ہی نہیں رکھی گئی ہے اور دوسرے مویشیوں میں ان کی قوتِ افزائش اور مالیت کو ملحوظ رکھ کر اور اس کی پرورش کے اخراجات کو سامنے رکھ کر زکوٰۃ کی شرح مقرر کی گئی ہے جو ایک تخمینہ کے مطابق تین تا چار فی صد ہے، اور بجائے فی صد کا تناسب مقرر کرنے کے جانوروں کا عدد مقرر کیا گیا،

کہ اس میں زکوٰۃ وصول کرنے والے اور دینے والے دونوں کو حسابی اور عملی اعتبار سے آسانی ہے۔

مقدار زکوٰۃ کے سلسلے میں اسلام کی ان تعلیمات کا دوسرے مذاہب کی تعلیمات سے تقابل کیا جائے تو شریعت اسلامی کے توازن، اعتدال اور حکمت و مصلحت سے ہم آہنگی کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً بائبل میں زمین کی تمام پیداوار اور درخت کے تمام پھلوں پر دس فی صد زکوٰۃ رکھی گئی ہے۔ جانوروں میں بلا تفریق ہر ایک میں دس فی صد زکوٰۃ مقرر کی گئی۔ اس میں جو حسابی دقت ہے وہ ظاہر ہے اس کے علاوہ بلا امتیاز امیر و غریب ہر شخص پر سالانہ آدھا مثقال واجب قرار دیا گیا۔ اس میں جو عدم توازن ہے وہ محتاج اظہار نہیں۔(۱)

(۱) یہ بات بائبل کے موجودہ نسخوں کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہے جس کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ انجیل مقدس کی اصل تعلیمات ہیں۔

باب: ۴

مصارف زکوٰۃ

مصارفِ زکوٰۃ

زکوٰۃ کی حیثیت چونکہ محض عام انفاق اور انسانی مدد کی نہیں ہے بلکہ یہ ایک اہم اسلامی عبادت اور شرعی فریضہ ہے، اس لیے شریعت نے اس کے مصارف اور مدات خرچ خود بنفس نفیس متعین کردیے ہیں، یہ اس لیے بھی مناسب تھا کہ اصل میں زکوٰۃ وصول کرنا اور غربا میں اس کو تقسیم کرنا اسلامی حکومت کا فریضہ ہے، اگر زکوٰۃ کے صرف کرنے میں مدات کی تحدید و تعیین نہ ہوتی تو اس بات کا امکان تھا کہ سلاطین اور حکمراں اس رقم کا غلط استعمال کرتے اور اسی سے اپنی عیش کوشیوں اور عشرت سامانیوں کے جذبات کی تسکین کرتے، پھر اس کے مدات ایسے متعین کیے گئے اور ناحق وصول کرنے پر ایسی ترہیبات بیان کی گئیں کہ غیر مستحق لوگ اس سے فائدہ اٹھانے کو اپنے لیے ہتک شان محسوس کرنے لگے تاکہ ان کے اس احساس کی وجہ سے غربا اور محتاجوں کا حق محفوظ رہے۔

ان مصارف کا ذکر خود قرآن مجید نے پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ کردیا ہے، ارشاد ہے:

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمؤلفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل الله وابن السبیل فریضة من الله والله علیم حکیم. (توبہ-۶۰)

زکوٰۃ فقرا، مساکین، عاملین (زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کے کارکنان) مؤلفۃ القلوب، غلام، مقروض، اللہ کے راستہ میں (جہاد کرنے والے) اور

مسافروں کے لیے ہے، یہ اللہ کی طرف سے (مقرر کیا ہوا) فریضہ ہے
اور اللہ بڑا علم والا اور بڑی حکمت والا ہے۔

کیا تمام مصارف میں زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری ہے؟

ان آٹھوں مصارف میں پہلی قابل غور بات یہ ہے کہ ایا زکوٰۃ کا ان تمام مصارف میں خرچ کیا جانا ضروری ہے یا ان میں سے کسی ایک مصرف میں بھی خرچ کر دیا جائے تو بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے کافی ہو جائے؟ اس مسئلہ میں فقہا کے درمیان اختلاف رائے ہے، اکثر فقہا کی رائے یہ ہے کہ کسی ایک مصرف میں بھی ایک شخص کا پوری زکوٰۃ ادا کر دینا کافی ہے، (۱) یہی رائے ائمہ اربعہ میں سے امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی ہے۔ امام شافعیؒ کا خیال ہے کہ ہر زکوٰۃ کو اس کے تمام مصارف میں خرچ کیا جانا چاہیے، البتہ جو مصارف ختم ہو چکے ہیں ان میں ظاہر ہے ادائیگی ممکن نہیں، نیز اگر ایک مد کے کئی مستحقین موجود ہوں تو ہر مد کے تین تین حقداروں پر زکوٰۃ تقسیم کی جائے گی۔ (۲)

حدیثیں اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ ایک مد میں بھی زکوٰۃ خرچ کی جاسکتی ہے، حضرت معاذؓ سے مروی ہے کہ جب آپ ﷺ نے ان کو یمن بھیجا تو ہدایت فرمائی کہ وہاں کے مالداروں سے زکوٰۃ لی جائے اور فقرائیں میں تقسیم کر دی جائے تؤخذ من اغنیائھم وترد فی فقرائھم (۳) یہ بھی ثابت ہے کہ بعض دفعہ آپ ﷺ کے پاس زکوٰۃ کا مال آیا اور آپ ﷺ نے اسے صرف ان نو مسلموں کو دے دیا جن کی تالیف قلب مقصود تھی، اسی طرح سلمۃ بن صخر بیاضی کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ اپنے قوم کی زکوٰۃ وصول کر کے خود رکھ لیں۔ (۴) عملاً بھی ہر شخص کے لیے اس بات کو واجب قرار دینا کہ وہ اپنی زکوٰۃ کو تمام مصارف میں خرچ کرے، زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لیے غیر معمولی زحمت کا باعث ہوگا۔

(۱) الجامع لاحکام القرآن ۱۶۷/۸، المغنی ۲۸۱/۲ (۲) کتاب الام ۸۰/۲ باب العلۃ فی القسم
(۳) ترمذی عن ابن عباس ۱۳۶/۱ باب ما جاء فی کراہیۃ اخذ خیار المال فی الصدقۃ
(۴) المغنی ۲۸۱/۲

فقراء و مساکین

ان مصارف زکوٰۃ میں سب سے پہلے قرآن نے فقراء و مساکین کا ذکر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف ہشت گانہ میں یہ دو مصرف اولین توجہ کے حقدار ہیں اور کیوں نہ ہو جب زکوٰۃ کا اصل مقصود ہی فقر واحتیاج کو دور کرنا اور ضرورتمندوں کی ضروریات کی تکمیل کرنا ہے اور اس اعتبار سے یہ دونوں طبقے سب سے بڑھ کر زکوٰۃ کے مقصود کو پورا کرتے ہیں۔

"فقیر و مسکین" عام طور پر اہلِ علم نے ان دونوں میں فرق کیا ہے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ بالکل متضاد اور معکوس قسم کا فرق لوگوں نے بتایا ہے، قرطبی نے اس سلسلہ میں نو اقوال ذکر کیے ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ فقیر وہ ہے جس کے پاس سامانِ کفایت کا کچھ حصہ ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو، بعضوں نے اس کے برعکس فقیر کو زیادہ محتاج اور مسکین کو کم محتاج مانا ہے، (۱) امام شافعیؒ نے بھی یہی بات لکھی ہے، کہ فقیر اسے کہتے ہیں کہ نہ اس کے پاس مال ہو اور نہ ہنر، اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ ہو، لیکن اتنا نہیں کہ ضروریات کے لیے کفایت ہو جائے، (۲) اور یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، اول اس لیے کہ فقراء کا پہلے اور مساکین کا بعد میں قرآن مجید میں مذکور ہونا اس بات کا قرینہ ہے کہ فقراء مساکین کے مقابلہ زیادہ حاجت مند ہیں، دوسرے خود قرآن نے ایک واقعہ کے ذکر میں کہا ہے

اما السفینۃ فکانت لمسٰکین یعملون فی البحر.
کشتی کچھ مسکینوں کی تھی جو سمندر میں کام کرتے تھے۔

قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مسکین کہا ہے وہ کشتی کے مالک تھے اور وہ اسی سے روزگار حاصل کرتے تھے، اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ مسکین کسی قدر مال کا مالک ہوتا ہے، مگر اتنے مال کا نہیں کہ اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو جائے، البتہ اہلِ لغت اور مفسرین کے اس اختلاف کا زکوٰۃ کے احکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہاں اگر وقف یا وصیت میں فقراء یا مساکین کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس وقت یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس کا حقدار ان دونوں میں سے کون سا طبقہ ہوگا؟

(۱) بدائع الصنائع ۴۳/۲، قرطبی ۱۶۹/۸ (۲) الام ۸۱/۲

فقر واحتیاج کا معیار

اس بات کو تو قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ زکوٰۃ فقراء کے لیے جائز ہے، لیکن فقر ایک اضافی چیز ہے اس لیے یہ سوال اب بھی وضاحت طلب ہے کہ کس درجہ کا فقر و مسکنت ہے جو زکوٰۃ کا استحقاق پیدا کرتا ہے؟ اس سلسلہ میں بھی ائمہ اربعہ کی آراء میں خاصا اختلاف ہے، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بنیادی ضروریات کے سوا کوئی شخص اتنی اشیاء یا جائداد کا مالک ہو، جس کی قیمت نصاب زکوٰۃ (۲/۱-۵۲ تولہ چاندی) کو پہنچ جائے تو اس کے لیے زکوٰۃ لینی جائز نہیں،(۱) حنابلہ کا خیال ہے کہ جو شخص پچاس درہم یعنی (۴/۱-۱۳ تولہ چاندی) یا اس کے ہم قیمت سونے کا مالک ہو،(۲) اس کے لیے زکوٰۃ جائز نہیں، اس سے کم کا مالک ہو تو زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ امام احمدؒ کا ایک اور قول اس سے بالکل مختلف ہے کہ گو وہ سونے اور چاندی ہی کے نصاب کا مالک کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ اس کے لیے کفایت نہیں کرتا ہو تو زکوٰۃ لے سکتا ہے،(۳) شوافع نے زکوٰۃ کے جائز ہونے کے لیے عملاً موجود ثروت کو معیار نہیں بنایا ہے بلکہ اس کی صلاحیت کو سامنے رکھا ہے۔ جو شخص اپنی جسمانی قوت و صلاحیت کے اعتبار سے کمانے اور کوئی صنعت اختیار کرنے کی قدرت رکھتا ہو، اس کے لیے زکوٰۃ لینی جائز نہ ہوگی ورنہ جائز ہوگی۔(۴)

حنابلہ کے پیش نظر وہ حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس پچاس درہم ہوں، اس کے لیے زکوٰۃ حلال نہیں،(۵) اور شوافع کے سامنے یہ ارشاد ہے کہ صدقہ طاقتور صحیح الخلقت آدمی کے لیے حلال نہیں(۶) احناف کا خیال ہے کہ ان احادیث کا منشا سوال کے رجحان کا سد باب ہے اور لوگوں کو زکوٰۃ مانگنے میں محتاط بنانا ہے نہ کہ دولت و فقر اور زکوٰۃ کی حلت و حرمت کے لیے معیار مقرر کرنا، اس کے لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض اوقات صحت مند اہل قوت کے لیے بھی زکوٰۃ لینے کی گنجائش رکھی ہے(۷) قرآن نے بھی اس کے لیے فقر واحتیاج

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۴۸

(۲) یہی حکم اتنے روپیوں کا ہوگا جس سے مذکورہ مقدار میں چاندی خریدی جاسکے۔

(۳) المغنی ۲/۷۲ (۴) تفسیر قرطبی ۸/۱۷۲

(۵) ترمذی عن ابن مسعود ۱/۱۴۱ باب من تحل لہ الزکوٰۃ

(۶) ترمذی عن حبشی بن جنادہ ۱/۱۴۱ باب ماجاء من لا تحل لہ الصدقۃ

(۷) دیکھیے: المغنی ۲/۲۷۸ قرطبی ۸/۱۷۳

کو اساس بنایا ہے نہ کہ کسی خاص مقدار یا صحت جسمانی کو، یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا زکوٰۃ "اغنیاء" سے لی جائے اور فقراء میں تقسیم کی جائے، گویا آپ ﷺ نے زکوٰۃ دینے اور لینے والے دو ہی طبقے مقرر فرمائے اور ایک کو "غنی" اور دوسرے کو "فقیر" قرار دیا۔ پس جو نصاب زکوٰۃ کا مالک ہو وہ غنی ہے اور جو اس کا مالک نہ ہو وہ فقیر ہے اور زکوٰۃ کا حقدار۔(۱)

معاشی اعتبار سے تین درجات

حنفیہ کے نزدیک معاشی اعتبار سے تین درجات ہیں، ایک وہ جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ـــــ دوسرے وہ جس میں زکوٰۃ کا لینا حرام ہو جاتا ہے، تیسرے وہ جس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے لیکن اس کے لیے خود زکوٰۃ طلب کرنی جائز نہیں، جو شخص دو سو درہم (۲/۱-۵۲ تولہ چاندی) بیس مثقال (۲/۱-۷ تولہ) سونا یا اس قیمت کا سامان تجارت یا زکوٰۃ کے لیے مطلوبہ تعداد میں مویشی کا مالک ہو، اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اموال زکوٰۃ سونا، چاندی، سامان تجارت اور حیوانات (۲) تو نہ ہوں لیکن دوسری اشیاء (جو بنیادی ضروریات کے علاوہ ہوں) اس کے پاس دو سو درہم (۲/۱-۵۲ تولہ چاندی) کی موجود ہوں مثلاً رہائشی مکان کے سوا مکان، استعمال کپڑوں کے سوا کپڑے، استعمالی برتنوں کے سوا قیمتی ظروف وغیرہ، تو اس پر زکوٰۃ تو واجب نہ ہوگی مگر اس کے لیے زکوٰۃ لینی بھی جائز نہ ہوگی ـــــ تیسرے وہ درجہ ہے جس میں زکوٰۃ مانگنی حرام ہوتی ہے، اس کا معیار کیا ہے؟ اس سلسلے میں اختلاف ہے، ایک دن کی خوراک موجود ہو، پچاس درہم (ساڑھے ۱۳ تولہ چاندی) موجود ہوں یا یہ تو نہ ہو لیکن اس کے اندر کمانے کی قوت نہ ہو(۳) تاہم فقہاء حنفیہ کے یہاں مسائل واحکام کی جو تفصیلات منقول ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ احناف نے اس کا معیار ضرورت وحاجت ہی کو بنایا ہے۔

کچھ اہم ضروری مسائل

اس سلسلے میں تفصیلات جو فقہاء نے ذکر کی ہے ان میں سے منتخب مسائل کا ذکر مناسب ہوگا: کسی شخص کے پاس کرایہ کی دوکانات ومکانات ہوں لیکن ان کا کرایہ اس کے اور اس کے

---

(۱) احکام القرآن للجصاص ۳/۱۲۹ (۲) بدائع الصنائع ۲/۴۸

(۳) فتح القدیر ۲/۲۰۳ نیز دیکھیے: بدائع الصنائع ۲/۴۸-۴۹

اہل وعیال کی ضروریات کے لیے ناکافی ہو تو اس شخص کے لیے زکوٰۃ لینی جائز ہوگی، یہ امام محمدؒ سے منقول ہے۔

۞ اسی طرح باغات یا کھیتیاں ہوں اور ان کی پیداوار گو دو سو درہم کی قیمت کی ہو مگر وہ پورے سال کی ضرورت ہی کے لائق ہوں، تو زکوٰۃ لینی جائز ہے۔(۱)

۞ دوسرے کے ذمہ دَین ہو، لیکن ادائیگی کے لیے مہلت مقرر ہو جو ابھی دور ہو اور اسے اپنی ضرورت خورد و نوش وغیرہ کے لیے رقم مطلوب ہو تو وہ شخص زکوٰۃ لے سکتا ہے، اسی طرح دَین تو ابھی ادا ہونا چاہیے لیکن مقروض دَین لینے سے انکار کرتا ہو یا اس موقف میں نہیں کہ دَین ادا کرے تو ایسی صورت میں بھی اس کے لیے زکوٰۃ لینی جائز ہوگی۔(۲)

۞ شوہر کے ذمہ عورت کا مہر مؤجل ہو اور وہ اپنی گذر اوقات کے لیے ابھی محتاج و ضرورت مند ہو تو ایسی عورت زکوٰۃ لے سکتی ہے۔(۳)

۞ کسی کو حقدار زکوٰۃ سمجھ کر زکوٰۃ دے دی بعد کو معلوم ہوا کہ وہ فقیر ہی نہیں ہے تو بھی زکوٰۃ ادا ہو گئی۔

۞ مستحق زکوٰۃ کے لیے ضروری ہے کہ جس وقت اس کو زکوٰۃ دی جائے، اس وقت وہ محتاج وضرورت مند ہو، مثلاً کسی شخص نے پیشگی کسی محتاج کو زکوٰۃ کی رقم دے دی اور جب سال پورا ہوا اور اصل میں زکوٰۃ کی ادائیگی کا وقت آیا اس وقت وہ محتاج شخص غنی ہو چکا ہے تو زکوٰۃ ادا ہو گئی۔(۴)

۞ زکوٰۃ کا مال کسی فقیر سے مالدار آدمی خرید کرلے تو صحیح یہی ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے اور وہ اس کے لیے جائز ہوگا۔(۵)

۞ فقر و دولت میں نابالغ بچے باپ کے تحت ہیں، اگر باپ کے لیے زکوٰۃ جائز نہ ہو تو ان بچوں کے لیے بھی جائز نہیں، اگر باپ فقیر و محتاج ہو اور زکوٰۃ کا حقدار ہو تو نابالغ بچوں کے لیے بھی زکوٰۃ جائز ہوگی، گو ماں غنی ہو۔(۶)

۞ بالغ لڑکوں کے فقیر و مالدار ہونے میں خود ان کا اعتبار ہے، باپ گو مالدار ہو لیکن لڑکے

---

(۱) حوالہ سابق　(۲) البحر الرائق ۱۴۰/۲
(۳) حوالہ سابق　(۴) تاتارخانیہ ۲۶۰/۲
(۵) البحر الرائق ۲۴۵/۲　(۶) حوالہ سابق

خود محتاج ہوں تو زکوٰۃ لے سکتے ہیں۔(۱)

۞ علوم دینیہ کے طلبا گو کمانے پر قادر ہوں، لیکن اگر علمی استفادہ و افادہ کے لیے خود کو فارغ کرلیں تو زکوٰۃ لے سکتے ہیں۔(۲)

۞ فقیر عالم کو زکوٰۃ دینے میں فقیر جاہل کو زکوٰۃ دینے سے زیادہ اجر و ثواب ہے۔(۳)

عاملین

قرآن مجید نے زکوٰۃ کا تیسرا مصرف "عاملین" کو قرار دیا ہے "عاملین" سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو امام المسلمین نے زکوٰۃ و عشر وغیرہ کی وصولی کے لیے مقرر کیا ہو: **الذین نصبهم الامام بجباية الصدقات.** (۴)

یہ عاملین چونکہ اپنے اوقات غربا اور اہل حاجت کے لیے زکوٰۃ و صدقات کی وصولی میں مشغول رکھتے ہیں، اس لیے اس مال سے جو دراصل فقرا کا حق ہے، ان کی بھی کفالت کی جاتی ہے کہ اگر اس کی اجازت نہ دی جاتی تو زکوٰۃ کی وصولی کا اجتماعی نظام اور حقداروں کے درمیان صحیح طریقہ پر اس کی تقسیم ممکن نہ ہوتی۔

عاملین کے بارے میں کئی مسائل فقہی اعتبار سے قابل توجہ ہیں:

۱ - اگر عاملین مال دار ہوں تو کیا ان کے لیے مال زکوٰۃ سے اپنے کام کا معاوضہ لینا جائز ہوگا؟

۲ - کیا بنو ہاشم اور سادات اس ذمہ داری پر مامور کیے جا سکتے ہیں اور کیا ان کو اس میں سے اجرت دی جا سکتی ہے؟

۳ - عاملین کو ان کے عمل کا کتنا معاوضہ دیا جائے؟

۴ - عاملین کے علاوہ دوسرے لوگ جو زکوٰۃ کے حساب و کتاب اور تقسیم وغیرہ کا کام کرتے ہوں، ان کا کیا حکم ہوگا؟

۵ - موجودہ زمانے میں دینی مدارس اور دوسرے اداروں کے محصلین عاملین ہی کے حکم میں ہیں یا نہیں۔؟

---

(۱) حوالہ سابق　(۲) در مختار علی الرد ۵۹/۲
(۳) ہندیہ ۱۸۷/۱　(۴) بدائع ۴۴/۲

صاحب نصاب عامل

عامل گو خود صاحب نصاب ہو اور اس طرح زکوۃ پانے کا مستحق نہ ہو پھر بھی اس کو زکوۃ کی رقم میں سے اس کی وصولی زکوۃ کی خدمت کا معاوضہ دیا جاسکتا ہے ویحل للعامل اخذ العمالة وان كان غنيا ۔ (۱) اس لیے کہ عاملین کو جو زکوۃ دی جاتی ہے اس میں ایک پہلو اجرت کار بھی ہے اور اس اعتبار سے عاملین بھی اپنے کام کی اجرت کے حقدار ہیں۔ البتہ اگر کسی شخص نے بطور خود اپنی زکوۃ بیت المال کو پہنچادی تو وہ اجرت کا حقدار نہیں ہوگا (۲) اگر عامل پیشگی اپنی وصولی کی اجرت حاصل کرنا چاہے تو یہ جائز تو ہے لیکن بہتر نہیں (۳) اگر مال زکوۃ عامل زکوۃ کے ہاتھ سے ضائع ہو جائے تو اس کی اجرت سے وہ محروم رہے گا (۴) عاملین کی حیثیت چونکہ فقراء کی طرف سے نائب اور وکیل کی ہوتی ہے اس لیے اگر زکوۃ وصول کرنے کے بعد اس سے ضائع ہو جائے تو زکوۃ ادا کرنے والوں کی زکوۃ ادا ہو گئی۔ (۵)

ہاشمی عاملین

بنوہاشم کو زکوۃ کی وصولی پر مامور کیا جاسکتا ہے، البتہ حنفیہ کے یہاں بجائے زکوۃ کی دوسری مدات کی رقم سے اس کو اجرت دی جائے گی، (۶) کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے غلام حضرت ابورافع کو عاملین کی مد سے اجرت لے کر زکوۃ وصول کرنے کی ممانعت فرمائی تھی، (۷) شوافع اور مالکیہ کا خیال ہے کہ وہ زکوۃ کی مد سے اپنی اجرت لے سکتے ہیں کہ یہ ان کے حق میں زکوۃ نہیں ہے بلکہ ایک عمل مباح کی اجرت ہے، خود حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو عامل زکوۃ مقرر فرمایا تھا اور حضور ﷺ نے اور آپ ﷺ کے خلفا نے بنوہاشم کے مختلف لوگوں کو زکوۃ کا عامل بنایا ہے، (۸) علامہ ابن نجیم مصریؒ نے لکھا ہے کہ سادات کا بحیثیت عامل، زکوۃ اجرت لینا حرام نہیں ہے، مکروہ ہے۔ (۹) اور شامی نے اس پر اضافہ کیا ہے کہ یہاں مکروہ سے "مکروہ

---

(۱) تاتارخانیہ ۲/۲۶۸ (۲) عالمگیری ۱/۱۸۸
(۳) تاتارخانیہ ۲/۲۶۸ تاہم پیش گی اجرت دینا امیر کی صوابدید پر موقوف ہے، حوالہ مذکور
(۴) عالم گیری ۱/۱۸۸ (۵) البحرالرائق ۲/۲۴۱
(۶) ردالمحتار ۲/۵۹ (۷) ترمذی ۱/۱۴۲ باب ماجاء فی کراھیۃ الصدقۃ
(۸) الجامع لاحکام القرآن ۸/۱۷۸ (۹) بحر ۲/۲۴۱

تحریمی" مراد ہے۔ (۱)

خیال ہوتا ہے کہ فی زمانہ سادات محصلین زکوۃ کو دیگر عطیات کی رقم سے اجرت ادا کی جانی چاہیے اور یہ رقم میسر نہ ہو تو مالکیہ اور شافعیہ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے زکوۃ کی رقم میں سے بھی اجرت ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں، واللہ اعلم۔

عاملین کو کس قدر اجرت دی جائے؟

امام شافعیؒ کے نزدیک آٹھ مصارف ہونے کی وجہ سے آٹھواں حصہ یعنی بارہ فی صد سے کچھ زیادہ اس پر صرف کیا جاسکتا ہے۔ اب چونکہ غلاموں کو آزاد کرنے (فی الرقاب) والا مصرف باقی نہیں رہا، اس لیے ساتواں حصہ یعنی ۱۴ فی صد تک بڑھایا جاسکتا ہے۔ (۲)

دوسرے فقہاء کی رائے ہے کہ عاملین کے لیے خاص اجرت متعین نہیں ہے، اتنی مقدار میں دی جائے کہ اس کے کام کے درمیان اس کے، اس کے بال بچے اور اس کی زیر پرورش دوسرے لوگوں کی ضروریات کے لیے متوسط مقدار کے مطابق کفایت کر جائے (۳) یہ اس کی وصولی کا پانچ فی صد بھی ہو سکتا ہے تینتیس فی صد بھی ہو سکتا ہے اور نصف بھی، بعضوں نے ضرورت ہو تو اس سے زائد حصہ بھی زکوۃ کی وصولی پر خرچ کرنے کی اجازت دی ہے، لیکن فتویٰ اس پر ہے کہ پچاس فی سے زیادہ اس پر خرچ نہ کیا جائے (۴) مالکیہ وغیرہ نے بھی عامل کے لیے کوئی خاص مقدار یا تناسب متعین نہیں کیا ہے (۵) قرطبی نے لکھا ہے کہ فی زمانہ صرف عامل زکوۃ اور اس کے اہل و عیال کی کفایت کے بقدر ہی اس کو دیا جائے گا۔ اعوان و انصار کے اخراجات کا لحاظ نہ کیا جائے گا کہ یہ اسراف محض ہے (۶) عاملین جب زکوۃ وصول کر کے لائیں تو ان سے حساب و کتاب بھی کیا جائے گا تاکہ ممکن حد تک بددیانتی کو روکا جاسکے۔ آپ ﷺ نے قبیلہ بنو سلیم سے زکوۃ کی وصولی کے لیے ایک صاحب کو مقرر فرمایا تو واپسی پر ان سے وصولی کا حساب لیا۔ (۷)

---

(۱) ردالمحتار ۲/۵۹ (۲) فتح القدیر ۲/۲۰۳ بدائع ۲/۴۴
(۳) عالم گیری ۱/۱۸۸ (۴) فتح القدیر ۲/۲۰۳ تاتارخانیہ ۲/۲۶۸
(۵) الجامع لاحکام القرآن ۸/۱۷۷ (۶) حوالۂ سابق
(۷) بخاری کتاب الزکوۃ باب قول اللہ تعالیٰ والعاملین علیہا

زکوٰۃ کے حساب وتقسیم کادوسرا عملہ

جیسے عاملین زکوٰۃ وعشر فقراء کے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنے آپ کو مشغول رکھتے ہیں، اسی طرح زکوٰۃ وعشر کے حساب وکتاب اوراس کی تقسیم وغیرہ کے لیےاور بھی عملہ مطلوب ہو سکتاہے، عام طور پر فقہاء نےاس مسئلہ سے بحث نہیں کی ہے لیکن علامہ قرطبی نےاس مسئلہ کو بھی چھیڑاہےاور لکھاہے :

على ان كل ماكان من فروض الكفايات كالساعى والكاتب والقسام والعاشر وغيرهم فالقائم به يجوز له اخذ الاجرة عليه . (۱)

علاوہ ازیں جن عہدوں کا قیام فرضِ کفایہ ہے جیسے مساعی، کاتب، تقسیم کنندہ عشر وصول کرنے والاوغیرہ توان فرائض کے انجام دینے والوں کے لیےاس کی اجرت لیناجائز ہے۔

نواب صدیق حسن خاں کہتے ہیں :

ولاينحصر العامل فى الساعى والجابى اذمنه القاسم والكاتب الذى يكتب ماأعطاه ارباب الاموال والعاشر الذى يجمع المستحقين والعريف والحاسب . (۲)

عامل محصل اور وصول کنندہ میں منحصر نہیں، تقسیم کنندہ، محرر جو مالکان مال کی زکوٰۃ کاحساب رکھیں، عاشر جو حقداروں میں تقسیم کرے، عریف اور محاسب سبھی اس میں داخل ہیں۔

فی زمانہ ایسے رفاہی اداروں اور دینی درس گاہوں کو بھی اسی زمرہ میں رکھاجاسکتاہے جو یہ خدمت انجام دیں، غور کیاجائے تو عاملین میں اپنے وسیع معنی کے اعتبار سے صرف محصلین ہی داخل نہیں، بلکہ زکوٰۃ کی جمع وتقسیم کے تمام کارکنان اس میں داخل ہیں۔

عاملین اور موجودہ محصلین

عاملین تو اصل میں وہ ہیں جن کو اسلامی حکومت کی طرف سے اس کام کے لیے

(۱) قرطبی ۱۷۸/۸ (۲) فتح البیان ۱۲۳/۴

مامور کیا جائے وہ زکوٰۃ کی وصولی کے لیے جبر بھی کرسکتے ہیں اور اگر صاحبِ نصاب اپنے اموال ظاہرہ(۱) کے بارے میں یہ کہیں کہ انھوں نے بطور خود اداکردی ہے توان کی بات کورد کرسکتاہے، شرعاً زکوٰۃ ان کے حوالہ نہ کرنے پر ایک آدمی گنہ گار بھی ہوگا، اس لیے ان احکام میں یہ سفراءو محصلین عاملین کے حکم میں نہیں ہیں۔

البتہ مالِ زکوٰۃ سے وصولی زکوٰۃ کی اجرت لینے اور ان کے حوالہ زکوٰۃ کردینے کی وجہ سے صاحبِ نصاب کے بری الذمہ ہوجانے وغیرہ احکام میں ان کاحکم عاملین ہی کاہوگا، فقہاء کے یہاں اس کی نظیریں موجود ہیں کہ امیر المسلمین کی عدم موجودگی میں بھی اسلام کے اجتماعی نظام کو برقرار رکھنے اور اسلامی احکام کی تعمیل میں جماعتی شان قائم کرنے کی غرض سے دوسری شخصیتوں کوامیر کے قائم مقام مان لیاگیاہے، جمعہ اور عیدین کے قیام کے لیے سلطان یااس کے نائب کی قید تھی، لیکن اکابر علماءہند نے امام ہی کو سلطان کے قائم مقام فرض کرکے جمعہ کو قائم رکھا،(۲) قاضی کا تقرر اصل میں امیر کی ذمہ داری ہے لیکن جہاں امیر موجود نہ ہو، وہاں عام مسلمانوں کی طرف سے بھی قاضی کے تقرر کوکافی سمجھا گیا۔(۳)

پس ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کے اتفاق وتراضی سے امیر شرعی مقرر ہواور امارت شرعیہ کانظام قائم ہواور امیر شرعی نے اپنی طرف سے عمال مقرر کئے ہوں، وہاں تو مسلمانوں پرواجب ہے کہ انہی عاملوں کوزکوٰۃ حوالہ کردیں(۴)اور جہاں ایسانظام شرعی موجود نہ ہو، وہاں دینی ادارے اور درس گاہیں زکوٰۃ کے اجتماعی طور پراکٹھاکرنے اور مستحقین تک پہنچانے کانظم کرسکتے ہیں اس لیے کہ دینی مدارس کے طلبا بھی زکوٰۃ کا بہترین مصرف ہیں، وہاں ان اداروں کی طرف سے وصولی زکوٰۃ کاکام کرنے والے جزوی طور پر عاملین ہی کے حکم میں ہیں کہ گووہ امیر المسلمین کی طرف سے اس کام پر مامور نہیں ہیں لیکن وصولی زکوٰۃ کاحق امیر کو تفویض کرنے سے شریعت کاجواصل مقصود ہے یعنی اجتماعی طور پر زکوٰۃ کی وصولی وتقسیم کانظم کرنا، وہ اس طرح پوراہوتاہےاور اصل اعتبار مقاصد ہی کاہے الامور بمقاصدها(۵) البتہ ان کو

(۱) جس مال کے تعمص وتلاش کے لیے لوگوں کی نجی زندگی میں دخل دینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔
(۲) امداد الفتاویٰ ۶۳۰/۱ (جدید) نیز در مختار ورد المحتار ۵۴۰-۴۱/۱
(۳) رد المحتار ۵۴۱/۱ (۴) اس سلسلہ میں تفصیل کیلئے کتاب العشر والزکوٰۃ دیکھی جائے
(۵) الاشباہ والنظائر ص : ۲۶

القلوب کی مد باقی ہے اور بوقت ضرورت اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس سلسلے میں ابن قدامہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جانا مناسب محسوس ہوتا ہے فرماتے ہیں :

"ہماری دلیل کتاب اللہ اور سنتِ رسول ہے، اللہ تعالیٰ نے مصارفِ زکوٰۃ میں ایک مصرف مؤلفۃ القلوب کو متعین فرمایا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے خود مصارفِ زکوٰۃ کا فیصلہ کردیا ہے۔ اور ان کی آٹھ قسمیں مقرر کی ہیں، مشہور حدیثوں کے مطابق آپ ﷺ مولفۃ القلوب کے مصرف میں کثرت سے عطیات دیتے تھے۔ اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول کو بغیر نسخ کے چھوڑنا جائز نہیں اور نسخ محض احتمال سے ثابت نہیں ہوتا، پھر یہ بھی لحاظ رہے کہ نسخ حیات نبوی ﷺ ہی میں ہو سکتا تھا، کیونکہ نص کے ذریعہ ہی کوئی حکم منسوخ کیا جاسکتا ہے اور وفات نبوی ﷺ اور زمانہ نبوی ﷺ کے ختم ہونے کے بعد نئی نص کا وجود نہیں ہو سکتا، پھر قرآن تو قرآن ہی سے منسوخ ہو سکتا ہے اور قرآن میں اس حکم کو منسوخ کرنے والی کوئی آیت نہیں، یہی حال حدیث کا ہے، پس کیسے کتاب و سنت کو محض رائے، تحکم، قولِ صحابی یا کسی اور وجہ سے چھوڑا جاسکتا ہے؟ یہ لوگ تو قولِ صحابی کو قیاس کے مقابلہ میں بھی حجت نہیں مانتے، پھر کتاب و سنت کو کیسے اس کی وجہ سے ترک کرتے ہیں چنانچہ امام زہریؒ نے فرمایا کہ مؤلفۃ القلوب کی ناسخ کوئی دلیل میرے علم میں نہیں اور لوگ جس بات کو دلیل بناتے ہیں اس میں اور کتاب و سنت میں کوئی تعارض نہیں، یہ مصارف ختم ہو جائیں تو ان کا حکم ختم نہیں ہوگا بلکہ جب ضرورتِ داعی ہوگی، دیا جائے گا، تو یہی حکم تمام اصناف کا ہے کہ اگر مصارفِ زکوٰۃ میں سے کوئی خاص صنف کسی زمانے میں موجود نہ ہو تو اس زمانے میں وہ مصرف باقی نہیں رہے گا، جب وہ صنف پائی جائے تو اس کا حکم بھی لوٹ آئے گا، یہی حکم

مؤلفۃ القلوب کے مسئلہ میں بھی ہے۔(۱)

امام ابو عبید جن کی "کتاب الاموال" خاص شہرت کی حامل ہے، لکھتے ہیں :

یہ آیت محکم ہے، کتاب و سنت میں اس کا کوئی ناسخ موجود نہیں، لہٰذا جب کسی قوم کا یہ حال ہو کہ کچھ لیے بغیر ان کو اسلام میں رغبت نہ ہو اور ان کے مرتد ہو جانے یا باغی بن جانے میں ان کے قوت و شوکت کی وجہ سے اسلام کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو، ایسی صورت میں امام ان کو زکوٰۃ میں سے دے سکتا ہے۔(۲)

در اصل جن حضرات نے مؤلفۃ القلوب کی مد کو باقی مانا ہے، ان کے پیش نظر یہ بات ہے کہ زکوٰۃ دوہرے مقاصد کے لیے فرض کی گئی ہے، غربا کی مدد کے لیے اور دعوت و اشاعتِ اسلام نیز حفاظتِ دین کے لیے، فی سبیل اللہ کا مصرف جس سے مراد بہت سے فقہاء کے یہاں "مجاہدین اسلام" ہیں کا مقصود سوائے غلبۂ اسلام کے اور کیا ہے؟ ـــــ اور یہ دونوں ضرورتیں اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گی، اس لیے ان کو باقی رہنا چاہیے ہاں ممکن ہے کہ بعض خاص حالات میں اس مد کی ضرورت باقی نہ رہے، جیسے فی زمانہ غلاموں کی مد والا مد موجود نہیں، یہ عارضی حالات کسی حکم کے مستقل طور پر منسوخ ہو جانے کی دلیل نہیں بن سکتے

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا رجحان بھی غالباً اس مد کے باقی رہنے کی طرف ہے، مصارف زکوٰۃ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

والثالث مال يصرف الى رفع الفتن الواقعة بين المسلمين اوالمتوقعة عليهم من غيرهم و ذلك اما ان يكون بمواطاة ضعيف النية فى الاسلام بالكفار او برد الكافر عما يريد من المكيدة بالمال ويجمع ذلك اسم المؤالفة قلوبهم .(۳)

تیسرا مصرف یہ ہے کہ مال زکوٰۃ غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں پر متوقع فتنوں یا خود مسلمانوں میں پیدا شدہ فتنوں کو دور کرنے کے لیے صرف کیا جائے اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ کسی ضعیف الاسلام کی مدد کی جائے جس کے کافروں سے تعلقات ہوں یا کوئی کافر فریب

(۱) المغنی ۲/۲۸۰ (۲) الاموال ص : ۶۰۷ (۳) حجۃ اللہ البالغۃ مع الترجمۃ ۲/۱۰۵

دینا چاہتا ہو تو اس کو مال دے کر روک دیا جائے، ان سب کو مؤلفۃ القلوب کا لفظ شامل ہے۔

غلام کی آزادی

قرآن میں ایک مصرف غلاموں کو آزادی دلانا بھی ہے، لیکن اب نہ غلام ہیں اور نہ ان کی آزادی کا مسئلہ، اس لیے اس مد کی تفصیل ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

غارمین ومقروض

زکوٰۃ کا چھٹا مصرف قرآن مجید کی زبان میں "غارمین" ہیں، "غارم" کا لفظ "مقروض" اور "قرض دہندہ" دونوں ہی معنوں کی گنجائش رکھتا ہے، قرض دہندہ کے معنی ہوں تو مراد یہ ہوگی کہ ایسا شخص جس کے دوسروں کے ذمہ قرضہ جات ہوں لیکن وہ ان کو وصول کرنے پر قادر نہ ہو اور نصاب زکوٰۃ ابھی اس کے قبضہ میں بھی نہ ہو، ایسا شخص زکوٰۃ لے سکتا ہے،(۱) اور اگر مقروض مراد ہوں جیسا کہ عام طور پر اہلِ علم نے لکھا ہے تو مقصود یہ ہے کہ ایک شخص گو صاحبِ نصاب ہو لیکن اس پر لوگوں کے قرض اتنے ہوں کہ ان کو ادا کرے تو صاحب نصاب باقی نہ رہے، ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے،(۲) اور عام فقراء کے مقابلہ ایسے شخص کو زکوٰۃ دینی زیادہ بہتر ہے۔(۳) فقہاء شوافع نے بھی مقروضوں کو زکوٰۃ دینے کی اجازت دی ہے لیکن تین شرطوں کے ساتھ، ایک یہ کہ قرض فوراً قابلِ ادائیگی ہو، دوسرے یہ کہ کسی مباح مقصد یا دینی اغراض کے لیے لیا گیا ہو، تیسرے اس کے بغیر ادائے قرض پر قادر نہ ہو۔(۴) مالکیہ بھی مقروض کو "غارمین" کی صف میں رکھتے ہیں اور اس میں خود ادائیگی کی صلاحیت نہ ہو تو زکوٰۃ سے مدد کرنے کی اجازت دیتے ہیں، قرطبی نے اس پر حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے بھی استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص کے خرید کیے ہوئے پھل آفت کے شکار ہوگئے اور اس پر دَین بہت بڑھ گیا، چنانچہ حضور ﷺ نے ان پر صدقہ کرنے کا حکم فرمایا:(۵) تاہم

(۱) فتح القدیر ۲/۲۰۳ (۲) احکام القرآن ۴/۳۲۷
(۳) تاتارخانیہ ۲/۲۷۰ (۴) شرح مہذب ۶/۲۰۷
(۵) الجامع لاحکام القرآن ۸/۱۸۳

ان توضیحات سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ غریب اور نصابِ زکوٰۃ سے محروم مقروضوں کی اس مد سے مدد نہ کی جائے گی وہ تو بدرجہ اولیٰ اس کے حقدار ہیں۔

لیکن فقہاء شوافع کے ہاں اس کے اصل مصداق وہ لوگ ہیں جو دو مسلمانوں کے درمیان شاصلاح اور رفع نزاع کے لیے خود کوئی مالی ذمہ داری قبول کرلیں، ایسے شخص کے بارے میں فتویٰ اس پر ہے کہ گو وہ غنی ہو پھر بھی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے زکوٰۃ کی مد سے اس کو دیا جاسکتا ہے،(۱) یہی رائے مالکیہ اور حنابلہ کی بھی ہے کہ مال دار وغنی شخص کو بھی اس مد سے دیا جاسکتا ہے، عہد نبوی ﷺ میں حضرت قبیصہ بن مخارقؓ نے ایک ایسی ہی ذمہ داری قبول کی تھی، تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ہمارے پاس صدقہ آجائے، تو اس میں سے تمہارے لیے حکم دیں گے، پھر ارشاد فرمایا کہ سوال تین ہی آدمیوں کے لیے جائز ہے، آپ ﷺ نے ان میں سے ایک ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو اس طرح کی ذمہ داری قبول کرلے رجل تحمل حمالۃ.(۲)

احناف کے ہاں وہ مالی ذمہ داریاں، جو حقوق اللہ میں ہیں، جیسے، کفارات وغیرہ، نیز مردہ کے ذمہ واجب الاداء دیون کی ادائیگی کے لیے زکوٰۃ کی رقم استعمال نہیں کی جائے گی، مالکیہ کے ہاں ہر طرح کے دیون وواجبات اس مد سے ادا کیے جائیں گے۔(۳)

فی سبیل اللہ

قرآن مجید نے زکوٰۃ کے ساتویں مصرف کے حیثیت سے "فی سبیل اللہ" کا ذکر کیا ہے، اس کے لغوی معنیٰ تو "اللہ کے راستے میں" کے ہیں جو ہر کار خیر کو شامل ہے مگر قرآن وحدیث میں اکثر مواقع پر یہ لفظ ایک خاص اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، اس لیے اس مصرف کی مراد میں فقہا) کے نقاط نظر میں ایک گونہ اختلاف ہے، اکثر فقہا کا خیال ہے کہ اس سے جہاد میں حصہ لینے والے مجاہدین مراد ہیں۔ البتہ اس کی تفصیل میں قدرے اختلاف ہے۔

مالکیہ کے یہاں مجاہدین پر صرف کرنے کے علاوہ دوسرے وسائل جہاد یعنی آلات

(۱) شرح مہذب ۶/۲۰۷ (۲) الجامع لاحکام القرآن ۸/۱۸۳
(۳) حوالہ سابق (۴) الجامع لاحکام القرآن ۸/۱۸۶
(۵) شرح مہذب ۶/۲۱۱ (۶) ردالمحتار ۲/۶۱

حرب وغیرہ کی تیاری میں بھی اس مد سے خرچ کیا جاسکتا ہے،(۴) شوافع کے یہاں جن مجاہدین کا حکومت کی طرف سے وظیفہ مقرر نہ ہو صرف انھیں کو اس مد سے دیا جاسکتا ہے،(۵) حنفیہ کے یہاں وہ مجاہدین مراد ہیں جو اپنے فقر کی وجہ سے سفر جہاد سے معذور ہوں،(۶) البتہ حنفیہ میں امام محمدؒ نے اس کا مصداق اس شخص کو قرار دیا ہے جس پر پہلے حج فرض ہو چکا ہے اور اب وہ حج ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہو،(۱) فتاویٰ ظہیریہ میں علوم دینیہ کے طلبہ کو "فی سبیل اللہ" کا مصداق قرار دیا گیا ہے،(۲) اور شامی نے "شرنبلالیہ" سے اس توجیہ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ یہ دقیع تفسیر ہے ،فالتفسیر بطالب العلم وجیہ خصوصا .(۳) فقہاء احناف میں علامہ کاسانی نے اس کی تشریح میں خاصی وسعت برتی ہے اور ہر کار خیر کو اس کا مصداق قرار دیا ہے۔

وفی سبیل اللہ عبارۃ عن جمیع القرب فید خل فیه کل من سعی فی طاعة اللہ وسبیل الخیرات . (۴)

فی سبیل اللہ تمام کار خیر سے عبارت ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نیکی کے کاموں میں جو بھی کوشش کی جائے وہ اس میں داخل ہے۔

لیکن جمہور فقہاء اور احناف کے درمیان ایک نکتہ پر ایسا اختلاف ہے جس نے حنفیہ کے یہاں اس کے مصداق میں بڑی تنگی پیدا کر دی ہے اور وہ یہ کہ احناف کے یہاں صرف وہ مجاہدین زکوٰۃ کے حقدار ہوں گے جو "فقراء" ہوں اگر وہ صاحبِ ثروت ہوں تو ان کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا :

لاتحل الزکوۃ لغنی ولا لذی مرۃ سوی . (۵)

زکوٰۃ غنی اور صاحبِ قوت و تندرست شخص کے لیے حلال نہیں۔

دوسرے فقہاء کی رائے ہے کہ اس مصرف کا مقصد فقراء کی حاجت پوری کرنا نہیں بلکہ اعلاءِ کلمۃ اللہ ہے ـــــ اس لیے مالدار و اغنیاء مجاہدین کو بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ امام قرطبی لکھتے ہیں :

(۱) البحر الرائق ۲/۲۴۲ (۲) تاتارخانیہ ۲/۲۷۰ البحر ۲/۲۴۲
(۳) ردالمحتار ۲/۶۱ (۴) بدائع الصنائع ۲/۶۱
(۵) جامع الترمذی ۱/۸۳

یہ کہنا کہ مجاہدین کو اس وقت دیا جائے گا کہ وہ فقیر ہوں، نص قرآنی پر زیادتی ہے اور نص پر کسی قید کا اضافہ ـــــ احناف کے یہاں ـــــ "نسخ" ہے اور "نسخ" قرآن یا حدیث متواتر ہی سے ہو سکتا ہے اور وہ یہاں موجود نہیں، بلکہ صحیح حدیث میں اس کے خلاف ارشاد نبوی ﷺ نقل کیا گیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا "زکوٰۃ پانچ صورتوں کے سوا مالداروں کے لیے روا نہیں، مجاہد فی سبیل اللہ، عامل زکوٰۃ، مقروض، (غارم) جو کسی اور سے زکوٰۃ میں آیا ہوا مال خرید کرلے، یا جس کا کوئی مسکین پڑوسی ہو اس پڑوسی کو زکوٰۃ دی گئی تو اس نے اپنے مالدار پڑوسی کو ہدیہ کر دیا۔(۱)

عام رفاہی کاموں جیسے مساجد، پلوں، مسافر خانوں، اور سڑکوں وغیرہ کی تعمیر، تجہیز و تکفین، مہمان نوازی وغیرہ میں زکوٰۃ کا مال خرچ نہیں کیا جاسکتا، اس پر ائمہ اربعہ متفق ہیں،(۲) بعض متاخرین اور معاصرین نے اس مد میں اتنی توسیع پیدا کر دی ہے کہ تمام ہی کار خیر کو اس مد میں داخل کر دیا ہے، لیکن روایات اور سلف صالحین کی عام روش جس کو قرآن مجید سبیل المومنین قرار دیتا ہے اس سے مطابقت نہیں رکھتی۔

مسافرین

زکوٰۃ کا ایک مصرف "مسافرین" بھی ہیں، گو وہ فی نفسہ صاحبِ ثروت ہوں، لیکن اگر حالتِ سفر میں محتاج ہو جائیں تو زکوٰۃ لے سکتے ہیں۔(۳)

اس حالت میں بھی مسافر کے لئے بہتر تو یہی ہے کہ خود محنت کر کے کمائے، یا قرض مل سکے تو قرض حاصل کر لے، لیکن زکوٰۃ لے لے تو حرج نہیں،(۴) البتہ ضرورت کے بہ قدر ہی لینا چاہیے(۵) تاہم اگر سفر پورا ہونے کے بعد زکوٰۃ کی کچھ رقم بچ رہی تو باقی ماندہ رقم کو صدقہ کرنا ضروری نہیں۔(۶)

(۱) الجامع لاحکام القرآن ۸/۱۸۶ (۲) المغنی ۲/۲۸۰ در مختار علی ہامش الرد ۲/۶۳
(۳) اتحاف علی الاحیاء ۴/۲۵۰ (۴) تاتارخانیہ ۲/۲۷۱
(۵) البحر الرائق ۲/۲۴۲ (۶) ردالمحتار ۲/۶۳

فقہاء نے ان لوگوں کو بھی ایسے ہی مسافر کے حکم میں رکھا ہے جو اپنے ہی وطن میں موجود ہوں لیکن ان کے مال تک ان کی رسائی نہ ہو۔(۱)

استحقاق زکوۃ اور فقر

یہ وہ مصارف تھے جو خود قرآن مجید نے زکوۃ کے باب میں نقل کیے ہیں۔ ان مصارف کے ساتھ کچھ اوصاف بھی ہیں جو زکوۃ کے استحقاق اور عدم استحقاق میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، ان میں بعض تو وہ ہیں جن کا ضمنی طور پر اوپر ذکر ہو چکا ہے مثلاً فقر واحتیاج، یہ زکوۃ کا مصرف بننے کے لیے ایک بنیادی سبب کا درجہ رکھتا ہے، اسی لیے بعض احادیث میں دوسرے مصارف زکوۃ کے بجائے محض فقر کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے کہ توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم .(۲) البتہ اس سے چند صورتیں مستثنیٰ ہیں، ایک عاملین زکوۃ کہ اگر وہ غنی بھی ہوں تو بالاتفاق زکوۃ لے سکتے ہیں، دوسرے مجاہدین اور تیسرے مصالحت بین المسلمین کے لیے مالی ضمانت قبول کرنے والے لوگ جن کو مالکیہ، شوافع اور حنابلہ "غارمین" کا مصداق قرار دیتے ہیں، چوتھے مؤلفۃ القلوب کا مد جس کو حنابلہ مطلقاً اور شوافع اس کی بعض صورتوں کو باقی سمجھتے ہیں، فقہاء حنفیہ کے نزدیک عاملین کے سوا ان تمام مدات میں زکوۃ کا اسی وقت خرچ کیا جانا جائز ہے جبکہ فقر موجود ہو۔

مسلمان ہونا

زکوۃ کا حقدار ہونے کے لیے مسلمان ہونا بھی شرط ہے، غیر مسلموں کو زکوۃ کی رقم نہیں دی جا سکتی، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو وصول زکوۃ کے لیے یمن بھیجا تو یہ ہدایت فرمائی کہ جو لوگ مسلمان ہوں انھیں میں سے مال داروں سے زکوۃ لی جائے اور انھی میں سے فقراء میں تقسیم کر دی جائے، اس سے صرف مؤلفۃ القلوب کا مد مستثنیٰ ہے کہ حنابلہ اور مالکیہ کی رائے میں غیر مسلم کو بھی ایمان کی تحریص یا دفع شر کے لیے زکوۃ دی جا سکتی ہے۔(۳)

(۱) دیکھیے: البحر الرائق ۲/۲۴۲، رد المحتار ۲/۶۳
(۲) بخاری عن ابن عباس ۱/۱۸۷ باب وجوب الزکوۃ (۳) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۱۸۳

بنو ہاشم وسادات

مختلف روایتیں موجود ہیں جن میں آپ ﷺ نے اہل بیت کے لیے صدقہ کو حرام قرار دیا ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضرت حسنؓ نے زکوۃ کی کھجور منہ میں رکھ لی تو آپ ﷺ نے اگلوا دیا اور ارشاد فرمایا: کہ ہم لوگوں کے لیے صدقہ کی چیزیں روا نہیں (۱) حضرت ابن عباسؓ نے عامل زکوۃ کی حیثیت سے اموال زکوۃ سے خدمت کا عوض لینا چاہا تو آپ ﷺ نے دینے سے انکار فرمادیا: ماکنت لاستعملک علی ذنوب المسلمین . (۲) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے بنو ہاشم کے موالی کے لیے بھی زکوۃ کو روا نہیں رکھا۔(۳)

کن لوگوں کے لیے زکوۃ لینا حرام ہے؟

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ پانچوں خاندان آل علی، آل عباس، آل جعفر، آل عقیل اور آل حارث پر زکوۃ حرام ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ عبد المطلب کی دوسری اولاد مثلاً آل ابولہب وغیرہ کے لیے زکوۃ حرام ہے یا نہیں؟ —— امام ابو حنیفہؒ ان کے لیے زکوۃ کو جائز قرار دیتے ہیں (۴) کیونکہ عزت و شرافت کے حقدار وہی ہیں جنھوں نے تنگیٔ وقت میں آپ ﷺ کی مدد کی تھی اور ابولہب چونکہ آپ ﷺ کی اذیت رسانی کے درپے تھا اور مرتے دم تک ایمان نہیں لایا تھا اس لیے اس کی اولاد اس اعزاز کی حقدار نہیں۔(۵)

صدقات نافلہ اور صدقات واجبہ

صدقات نافلہ کے بارے میں فقہاء کا عام رجحان یہی ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح بنو ہاشم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں (۶) لیکن صدقات واجبہ اور زکوۃ فی زمانہ بنو ہاشم کو دینا جائز ہے یا نہیں؟ امام طحاوی نے امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ نقل کیا ہے کہ بنی ہاشم پر ہر طرح کے صدقات

(۱) مسلم ۱/۳۴۳ (۲) کنز العمال ۴/۳۰۹
(۳) ترمذی ۱/۸۷ بسند حسن صحیح
(۴) رحمت الامہ ص: ۴۵-۴۶ نیز دیکھیے: در مختار علی الرد ۲/۲۹۹
(۴) ملخص از: ۵۴۔ عبادات اور چند اہم جدید مسائل ۱/۱۵۲ (۵) فتح القدیر ۲/۲۱۳
(۶) الجامع لاحکام القرآن ۸/۱۹۱

دینے میں کوئی مضائقہ نہیں اور بقول امام طحاوی امام ابو حنیفہؒ نے اس رائے کو اس لیے اختیار کیا ہے کہ خمس میں ذوی القربیٰ کا حصہ رکھا گیا تھا، جب یہ اس حصہ سے محروم ہو گئے اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد یہ حصہ بھی دوسروں کی طرف منتقل ہو گیا تو اس کی وجہ سے زکوٰۃ و صدقات جو ان پر حرام تھی حلال ہو گئی۔(۱)

دیگر فقہاء میں سے امام مالک کا مشہور قول(۲) شوافع کا عام معروف و معمول اور حنابلہ کی صحیح رائے یہ ہے کہ بنوہاشم کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں۔ لیکن فقہاء مالکیہ میں ابہری(۳)، ابن حجر کے بیان کے مطابق بعض شوافع(۴) اور حنابلہ میں امام ابن تیمیہؒ(۵) جیسے فقہاء سے صراحت ملتی ہے کہ جب خمس کی مخصوص مد باقی نہیں رہ گئی ہے، تو اب سادات کے لیے زکوٰۃ لینی جائز ہو گی۔

ان حضرات کے پیش نظر یہ ہے کہ سادات کے لیے زکوٰۃ حرام ہونے کی حکمت یا علت خمس میں ان کا استحقاق ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا :

لایحل لکم اهل البیت من الصدقات انما هی غسالة الایدی
وان لکم فی خمس الخمس لما یغنیکم . (۶)

تم اہل بیت کے لیے صدقات حلال نہیں کہ یہ ہاتھوں کا دھون ہے اور تمہارے لیے مالِ غنیمت کے خمس کا خمس ہے، جو تم کو اس سے بے نیاز کر دے گا۔

لہٰذا جب یہ مخصوص مد باقی نہیں رہی تو سادات کو اس سے بھی محروم رکھنا قرین انصاف نہ ہو گا، گرچہ ان ائمہ کی اس دلیل پر کافی کلام کی گنجائش ہے، لیکن فی زمانہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی ذلت جو "سادات کے لیے حرمت زکوٰۃ کا بنیادی مقصد ہے" سے بچانے کے لیے سادات کے لیے زکوٰۃ کی اجازت اب ایک ضرورت بن گئی ہے اور ضرورت کی بناء پر قول ضعیف پر بھی فتویٰ دیا جا سکتا ہے جیسا کہ فقہاء کی صراحتیں اس سلسلے میں موجود ہیں۔ هذا ما عندی والله اعلم بالصواب .

---

(۱) طحاوی ۱/۳۰۱ (۲) الجامع لاحکام القرآن ۱۹۱/۸
(۳) فتح الباری ۳/۳۵۴ (۴) حوالہ سابق
(۵) فتاویٰ شیخ الاسلام ۳/۳۵۲ (۶) طبرانی عن ابن عباس، الدرایہ علی الهدایہ ۱/۲۰۶

نسبی یا ازدواجی قرابت

یہ بات بھی ضروری ہے کہ زکوٰۃ دینے والے اور زکوٰۃ لینے والے کے درمیان ایسا رشتہ نہ ہو کہ مملوکہ اشیاء کے منافع میں وہ شریک رہتے ہوں چنانچہ والدین اور پورا آبائی سلسلہ اولاد اور اس کے ذریعہ پورا ازلی سلسلہ نیز زوجین کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی(۱) البتہ اس میں اختلاف ہے کہ بیوی شوہر کو زکوٰۃ دے سکتی ہے یا نہیں؟ احناف کے نزدیک نہیں دے سکتی ہے، دوسرے فقہاء کے نزدیک دے سکتی ہے، یہی رائے مالکیہ شوافع وغیرہ کے علاوہ خود امام ابو حنیفہؒ کے دونوں تلامذہ قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی بھی ہے۔(۲)

جن مستحقین کو زکوٰۃ دینی بہتر ہے!

زکوٰۃ کے تمام مصارف وہ ہیں جن میں زکوٰۃ کی رقم کو خرچ کرنا جائز ہے، البتہ کچھ لوگ ہیں جن کو شریعت نے اس باب میں زیادہ حقدار سمجھا ہے، اس سلسلے میں بنیادی اصول تو یہ ہے کہ جو زیادہ ضرورت مند ہو، وہ زکوٰۃ کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے، اس کے علاوہ دوسرے قرابت داروں کو جن کے لیے زکوٰۃ لینی جائز ہے، ان کو زکوٰۃ دینا زیادہ بہتر ہے اور اس میں ثواب بھی زیادہ ہے جیسے بھائی بہن، چچا، پھوپھی، خالہ، ماموں وغیرہ، ان کو زکوٰۃ دینے میں دوہرا ثواب ہے، زکوٰۃ بھی ادا ہو گی اور صلہ رحمی کا حق بھی ادا ہو گا، بلکہ فقہا نے یہ بھی لکھا ہے کہ رشتہ دار اگر کہیں دوسری جگہ رہتے ہوں تو اپنے اہلِ شہر کے مقابلہ دوسرے شہر میں رہنے والے رشتہ دار کو زکوٰۃ دی جائے(۳) رشتہ داروں میں فقہا نے یہ ترتیب بیان کی ہے کہ بھائیوں، بہنوں پھر ان کی اولاد پھر چچا اور پھوپھی پھر ماموں اور خالہ پھر دوسرے رشتہ دار زکوٰۃ کے زیادہ حقدار ہیں(۴) یہ بات بھی بہتر ہے کہ زکوٰۃ دینے میں اپنے اہلِ شہر کو مقدم رکھا جائے، ہاں اگر دوسری جگہ زیادہ محتاج لوگ ہوں یا کوئی زیادہ اہم مصرف ہو یا اقرباء ہوں تو دوسرے شہر میں زکوٰۃ بھیجنے میں قباحت نہیں بلکہ زیادہ بہتر ہے(۵) ہمارے زمانہ میں دینی مدارس اور دینی اداروں، مدرسوں،

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۳۹ نیز دیکھیے : شرح مہذب ۶/۲۲۹، المغنی ۲/۲۶۹
(۲) الجامع لاحکام القرآن ۸/۱۹۰ تاتارخانیہ ۲/۲۷۱ (۳) در مختار ۲/۶۸
(۴) رد المحتار ۲/۶۸-۶۹ (۵) تاتارخانیہ ۲/۲۸۲-شوافع کے ہاں تو اہل شہری
میں زکوٰۃ کی تقسیم واجب ہے، دیکھیے : شرح مہذب ۶/۲۱-۲۲۰

تنظیموں اور تحریکات کو جو زکوٰۃ بھیجی جاتی ہے وہ اسی قبیل سے ہے۔

اس پر بھی فقہا کا قریب قریب اتفاق ہے کہ محتاج علماء، علوم دینیہ کے طلبہ صوفیہ وزہاد اور دینی کام کرنے والوں کی زکوٰۃ سے مدد کرنا زیادہ ثواب کا باعث ہے، (۱) خود قرآن مجید نے ایسے لوگوں کی مدد کی تلقین کی ہے جن کو دین کے کام نے گھیر رکھا ہے اور عام لوگوں کی طرح وہ کسبِ معاش کے لیے اپنا وقت فارغ نہیں کرپاتے۔

للفقراء الذين احصروا فی سبیل الله لایستطیعون ضربا فی الارض یحسبهم الجاهل الاغنیاء من التعفف ، تعرفهم بسیمٰهم لا یسئلون الناس الحافاً وما تنفقوا من خیر فان الله به علیم .

(بقرہ - ۲۷۳)

(صدقات میں) اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہیں، ملک میں کہیں چل پھر نہیں سکتے، ناواقف انہیں غنی خیال کرتا ہے ان کے سوال سے احتیاط کے باعث، تو انھیں ان کے بشرہ ہی سے پہچان لے گا، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے اور تم مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ اس کا خوب جاننے والا ہے۔

زکوٰۃ کی کتنی مقدار دی جائے؟

زکوٰۃ حقدار زکوٰۃ کو کتنی مقدار میں دی جائے؟ اس سلسلے میں خلاصہ یہ ہے کہ اس سے ضرورت پوری ہو جائے۔ مقروض ہو تو قرض ادا ہو جائے، مسافر ہو تو منزل تک پہنچ جائے اور مجاہد ہو تو جہاد کے لیے کافی ہو جائے عامل ہو تو اس کے مناسب حال اجرت (۲) فقراء و مساکین کے بارے میں، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اور بعض دیگر فقہا کا مسلک یہ ہے کہ مساکین کو ایک نصاب زکوٰۃ (یعنی ۶۱۲.۳۵ گرام چاندی کے بقدر) سے کم مقدار میں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، اس سے زیادہ نہیں (۳) امام ابوحنیفہؒ کے ہاں بھی اتنی مقدار میں زکوٰۃ دینی کہ شرعاً وہ "غنی" شمار ہو، مکروہ ہے اس لیے کہ ایک نصاب کا مالک بننے کے بعد وہ "غنی" ہو گیا اور زکوٰۃ کا حقدار نہیں

(۱) ردالمحتار ۶۹/۲ (۲) المغنی ۲۸۲/۲
(۳) حوالہ سابق

رہا، لیکن زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ پورا مال بیک وقت دیا گیا ہے، اس طرح زکوٰۃ اس وقت ادا کی گئی ہے جب کہ وہ فقیر تھا (۱) البتہ مستحب طریقہ ہے کہ دو دو چار چار روپے تقسیم کرنے کے بجائے ایک شخص کو اتنی مقدار میں زکوٰۃ دی جائے کہ اسے دستِ سوال دراز نہ کرنا پڑے۔ (۲)

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ بعض دفعہ ایسی ضرورتیں پیش آجاتی ہیں کہ ایک نصاب سے کم مقدار اس کو پورا نہیں کرسکتی۔ مثلاً کسی سنگین مرض کا آپریشن یا لڑکی کی شادی وغیرہ، ایسے مواقع پر ایک سے زیادہ نصاب دینے میں بھی حرج نہیں، اس لیے کہ شریعت کا اصل منشاء ضروریات انسانی کی تکمیل ہے اور وہ یہاں بغیر اس کے ممکن نہیں، اس لیے قرطبی نے متاخرین حنفیہ سے نقل کیا ہے:

هذا اذا لم یکن له عیال ولم یکن علیه دین فان کان علیه دین فلاباس ان یعطیه مائتی درهم اواکثر مقدار مالو قضی به دینه یبقی له دون المائتین وان کان معیلا لاباس بان یعطیه مقدار مالو وزع علی عیاله اصاب کل واحدمنهم دون المائتین ، لان التصدق علیه فی المعنی تصدق علیه وعلی عیاله .

یہ اس وقت ہے جب کہ لوگ اس کے زیرِ پرورش نہ ہوں اور نہ اس پر دَین ہو، اگر اس پر دَین ہو تو دو سو درہم یا اس سے زیادہ مقدار دینے میں حرج نہیں کہ دَین ادا کرنے کے بعد دو سو درہم سے کم باقی رہ جائے، اور اگر اس کے لوگ اس کے زیرِ پرورش ہوں تو اتنا دینے میں حرج نہیں کہ اگر تمام زیرِ پرورش لوگوں پر تقسیم کیا جائے تو ان میں سے ہر ایک کے حصہ میں دو سو درہم سے کم پڑے، اس لیے کہ اس پر صدقہ کرنا دراصل اس پر اور اس کے زیرِ پرورش لوگوں پر صدقہ کرنا ہے۔

پھر خود قرطبی نے اس رائے کی تحسین کرتے ہوئے لکھا ہے، هذا قول حسن ۔ (۳)

(۱) البحرالرائق ۲۴۹/۲ (۲) حوالۂ سابق
(۳) الجامع لاحکام القرآن ۱۹۱/۸

تملیک ضروری ہے

مصارف زکوٰۃ کاذکر کرتے ہوئے چونکہ قرآن مجید نے حرف "لام" کا استعمال کیا ہے انما الصدقات للفقراء الخ اور عام طور پر مفسرین نے یہاں "لام" کو تملیک کے معنی میں رکھا ہے۔ اس لیے علماء کی رائے ہے کہ فقراء اور مساکین وغیرہ پر زکوٰۃ کی جو بھی رقم خرچ کی جائے وہ اس طرح کہ ان کو مالک بنادیا جائے۔ ایسی تمام صورتیں جن میں مالک بنانے کی کیفیت نہ ہو یا جس مصرف میں رقم خرچ کی جارہی ہے، اس مصرف میں مالک بننے کی صلاحیت ہی نہ ہو، تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی چنانچہ:

- مردہ کی تجہیز وتکفین میں زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی، اس لئے کہ مردہ کے اندر زکوٰۃ کا مالک بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اسی طرح اس سے مردہ شخص کا قرض بھی ادا نہیں کیا جاسکتا۔(۱)
- مسجد کی تعمیر میں بھی زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی(۲) پلوں کی تعمیر، سڑکوں کی مرمت نہر وآب رسانی کے نظم اور اس طرح کی دوسری چیزوں میں بھی زکوٰۃ صرف نہیں کی جاسکتی۔(۳)
- زکوٰۃ کی رقم سے غلہ خرید کر فقراء کے حوالہ کردیا جائے یا کھانا بنا کر ان کے درمیان تقسیم کردیا جائے تو یہ بھی کافی ہے۔ لیکن اگر جمع کر کے ان کو کھانا کھلا دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی اس لیے کہ فقہی اعتبار سے یہ اباحت ہے نہ کہ تملیک، اور زکوٰۃ ادا ہونے کے لیے تملیک ضروری ہے یشترط ان یکون الصرف تملیکا لا اباحة.(۴) اس اصول سے اندازہ ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے اعتبار سے دینی مدارس میں کھانے کی تقسیم مدرسہ کے طلبہ کو دستر خوان پر بٹھا کر کھانا کھلانے سے بہتر ہے۔
- زکوٰۃ کی رقم کو قرض کے لین دین کے لیے محفوظ کرنا یا کاروبار میں لگانا اور اس کا نفع فقراء پر تقسیم کرنا درست نہیں اور اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔

---

(۱) ہدایہ مع الفتح ۲/۲۰۷   (۲) حوالہ سابق

(۳) مجمع الانہر ۱/۲۲۲   (۴) در مختار علی ہامش الرد ۲/۸۵

حیلۂ تملیک اور اس کی شرعی حیثیت

البتہ اگر کہیں ایسے ضروری مدات موجود ہوں جو دینی اور قومی ضروریات کے اعتبار سے خاص اہمیت کے حامل ہوں لیکن زمام حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہو اور نہ ایسا بیت المال موجود ہو جس میں مختلف مدات کے لیے رقوم ہوں تو ایک شرعی دینی ضرورت کی تکمیل کے لیے اس میں کوئی قباحت نہیں کہ بالواسطہ طور پر زکوٰۃ کی رقم اس مد میں صرف کی جائے، اسی کو حیلہ تملیک کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات لوگ حیلہ کے لفظ سے گھبراتے ہیں حالانکہ حیلہ حسن تدبیر کا نام ہے جو اپنے مواقع استعمال کے اعتبار سے کبھی قابل تعریف اور مزاج شریعت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ اور کبھی نفسانی اور غیر اسلامی جذبات کے تحت ناپسندیدہ، مزاج شریعت کے مغائر اور اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کے مترادف ہوتا ہے، ہندوستان اور اس جیسے ملکوں میں نیز ان مسلم ممالک میں جہاں شریعت اسلامی کو ایوانِ حکومت کے قریب آنے کی بھی گنجائش نہیں، اکثر مواقع پر "حیلہ تملیک" ایک ضرورت کا درجہ رکھتی ہے۔

اس لیے اس میں کوئی قباحت نہیں کہ ضروری دینی اور قومی کاموں کے لیے کسی فقیر محتاج اور مستحق زکوٰۃ کو مالک بنا کر دیا جائے۔ پھر وہ ان ضروریات میں اس رقم کو خرچ کرے۔ اکثر فقہاء نے لکھا ہے۔

وحيلة التكفين بها التصدق على فقير ثم هو يكفن فيكون الثواب لهما وكذا فى تعمير المسجد . (۱)

کسی مستحق زکوٰۃ کے یہاں قرض باقی ہو اور وہ ادائیگی کے موقف میں نہ ہو تو قرض معاف کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی لیکن اگر یہ تدبیر اختیار کرے کہ مقروض کو زکوٰۃ کی رقم دیدے، پھر اس سے قرض وصول کرلے تو اس میں کوئی قباحت نہیں، (۲) البتہ یہ ضروری ہے کہ یہ سہارا بدرجہ مجبوری لینا چاہیے، دینی مدارس میں جو رقم صرف ہوتی ہیں ان میں حیلہ تملیک سے بہ سہولت بچا جاسکتا ہے، مہتمم سفراء اور منتظمین کی تنخواہیں تو اس لیے دی جاسکتی ہیں کہ فقہاء نے "عاملین" میں زکوٰۃ کی وصولی وتقسیم کرنے والوں اور نظم ونسق انجام دینے والوں کو بھی

---

(۱) در مختار علی ہامش الرد ۲/۱۹۱

۔ "حیلہ تملیک" سے متعلق یہ سطریں "فی سبیل اللہ" کے سلسلے میں فقہاء کے عمومی نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں کہ اس کا مصداق صرف مجاہدین ہیں

(۲) الاشباہ والنظائر ص: ۳۰۷ الفن الخامس الحیل

شامل رکھا ہے، طلبہ کو جو کھانے دیے جاتے ہیں اگر وہ تقسیم کر کے طلبہ کو مالک بنادیا جائے تو اس سے بھی زکوۃ ادا ہو گئی، ضروریات کے لیے جو وظائف دیے جاتے ہیں، اس میں بھی تملیک پائی جاتی ہے اور زکوۃ ادا ہو جاتی ہے، رہ گئی اساتذہ کی تنخواہیں اور دوسری مدات تو اگر طلبہ کو تعلیمی وظائف کی رقم دی جائے اور ان سے فیس وصول کر لی جائے تو اب حیلہ تملیک کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حیلہ تملیک کے اس طریقہ سے ان ضروریات کے لیے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، جو فی زمانہ اسلام کی سربلندی کے لیے پیدا ہو گئی ہیں، زکوۃ کے مصارف پر ایک نظر ڈالنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے بنیادی مقاصد حاجت مندوں کی ضروریات کی تکمیل اور اسلام کی سربلندی ہے، آج اسلام کی سربلندی کے لیے جو وسائل مطلوب ہیں، وہ ماضی سے بالکل مختلف نوعیت کے ہیں، ان مقاصد کے لیے تملیک کے حیلہ کے ذریعہ بالواسطہ زکوۃ کی آمدنی سے فائدہ اٹھانا مزاج شریعت کے عین مطابق ہے۔

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ سے ایک صاحب نے "عملہ ودفتر انجمن ہائے تبلیغ و حفاظت اسلام" کی تنخواہ اور مصارف خوراک وسفر پر زکوۃ کی رقم خرچ کرنے کی بابت سوال کیا ہے، مفتی صاحب نے اس کا جواب دیا ہے، اس میں فرماتے ہیں :

> "غرض یہ ہے کہ فی سبیل اللہ میں بے شک موافق تفسیر صاحب بدائع کے جملہ مصارف خیر داخل ہیں لیکن جو شرط ادائے زکوۃ کی ہے وہ سب جگہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ بلا معاوضہ تملیک محتاج کی ہونی ضروری ہے، اس لیے حیلہ تملیک اول کر لینا چاہیے تاکہ تملیک کے بعد تبلیغ وغیرہ کے ملازمین کی تنخواہ وغیرہ میں صرف کرنا اس کا درست ہو جاوے"۔(۱)

❁❁❁❁❁❁❁

(۱) فتاویٰ دار العلوم ۶/ ۲۸۳

اسلام کا نظام عشر و زکوۃ

باب: ۵

زکوۃ کا اجتماعی نظام

زکوۃ کا اجتماعی نظام

"اجتماعیت" اسلام کی تمام عبادات اور معاملات کی روح ہے، نماز گھر کے گوشہ تنہائی میں بھی ادا ہو سکتی تھی، مگر فرائض پنجگانہ کے لیے مسجد میں جماعت کو واجب قرار دیا گیا اور جمعہ وعیدین میں ایک وسیع تر اجتماع کی صورت پیدا کی گئی۔ روزے مختلف علاقوں کے لوگ الگ الگ مہینوں میں رکھ سکتے تھے، لیکن سال کا ایک خاص مہینہ مقرر کیا گیا کہ مسلمانانِ عالم خاص انہی دنوں میں روزے رکھیں، حج کے ذریعہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے اہلِ ایمان کو اس شان سے جمع کیا جاتا ہے کہ نہ کالے گورے کا امتیاز ہے، نہ دولت مند و غریب کا فرق، نہ حاکم اور محکوم کی تفریق ہے نہ سلطان اور رعایا کی درجہ بندی، لباس کی یکسانیت بھی دیدنی ہے اور زبان کے بول میں بھی وحدت کی رعایت ہے، یہ تو عبادات کا حال ہے، سیاسی اور اجتماعی زندگی کی تو بنیاد ہی اسی پر ہے، یہاں تک کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کو جاہلیت کی موت قرار دیا کہ کسی امیر کے ہاتھ میں مسلمان اپنی اطاعت و فرماں برداری کا ہاتھ نہ رکھے، "امیر" نیک و پارسا ہو یا فاسق و فاجر، اس کے ماتحت جہاد کا حکم فرمایا گیا اور نماز میں اس کی اقتداء گوارا کرنے کی تلقین فرمائی۔

اسلام کی یہی شان اجتماعیت زکوۃ میں بھی کار فرما ہے، زکوۃ کی نظریاتی اساس اس کے سوا اور کیا ہے کہ افراد اپنے مال میں جماعت اور سوسائٹی کا حق بھی سمجھیں اور اسے ادا کریں؟ لیکن اسلام نے اس سے بڑھ کر زکوۃ کی جمع و تقسیم کا بھی اجتماعی نظام قائم کیا اور اسلامی حکومت

کو اس بات کا حقدار قرار دیا کہ وہ مال داروں سے زکوٰۃ وصول کرے اور حق داروں میں تقسیم کرے، افسوس کہ خلافتِ اسلامی سے محرومی اور مجبوری نے زکوٰۃ کے اس اجتماعی نظام کا تصور ہی مٹا کر رکھ دیا، حالانکہ کتاب و سنت کی نصوص، خلافت راشدہ کا معمول اور فقہاء امت کی تصریحات قدم قدم پر اس کی شہادت دیتی ہیں، قرآن مجید نے آپ ﷺ کو وصولی زکوٰۃ کا حق دیا اور فرمایا۔

خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها وصلّ عليهم ان صلوتك سكن لهم والله سميع عليم . (توبہ-۱۰۳)

ان کے مالوں سے زکوٰۃ وصول کیجئے کہ یہ ان کو پاک کرے گی اور ان کا تزکیہ ہوگا، نیز ان کے لیے دعا فرمائیے کہ آپ ﷺ کی دعا ان کے لیے سامانِ سکون ہے، اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

آپ ﷺ کے بعد اب یہ حق مسلمانوں کے امیر و والی کی طرف آگیا، علامہ کاسانی نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

فدل ان للامام المطالبة بذالك والاخذ . (۱)

اس آیت نے اس بات پر دلالت کیا کہ امام کو زکوٰۃ کے مطالبہ اور وصولی کا حق ہے۔

امام ابو بکر جصاص نے مزید تاکید و اہتمام کے ساتھ اس فریضہ اجتماعی کی نشاندہی کی ہے، اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں :

يدل على ان اخذ الصدقات الى الامام وانه متى اداها من وجبت عليه الى المساكين لم يجز لان حق الامام قائم فى اخذها فلا سبيل الى اسقاطه . (۲)

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی امام کا حق ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہو، اگر وہ خود مساکین کو ادا کردیں تو کافی نہ ہو، اس لیے کہ اس کی وصولی کا حق امام کے لیے ثابت ہے، لہٰذا اس کو ساقط کرنے کی کوئی راہ نہیں۔

قرآن مجید نے زکوٰۃ کا ایک مصرف "عاملین" یعنی حکومت کی طرف سے مقررہ

(۱) بدائع الصنائع ۳۵/۲ (۲) احکام القرآن ۳/ ۳۶۴

محصلین کو قرار دیا ہے، (توبہ-۶۰) یہ محصلین کا تقرر اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے کی حقدار اصل میں حکومت اسلامی ہے، وہی لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرے گی اور مستحقین میں تقسیم کرے گی۔ علامہ کاسانی اس نکتہ کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

فلو لم يكن للامام ان يطالب ارباب الاموال بصدقات الانعام فى اماكنها وكان اداء ها الى ارباب الاموال لم يكن لذكر العاملين وجه . (۱)

اگر امام کو اہلِ سرمایہ سے مویشیوں کی زکوٰۃ ان کی جگہوں پر طلب کرنے کا حق نہیں ہوتا اور ارباب سرمایہ کو خود زکوٰۃ ادا کرنے کا حق ہوتا تو "عاملین" کے مصرف کا ذکر نہ ہوتا۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں یہی معمول رہا، آپ ملک کے مختلف حصوں میں اپنے عمال کو روانہ فرماتے جو زکوٰۃ وصول کیا کرتے، حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا تو ان کو بھی تلقین کی کہ چونکہ وہ آپ ﷺ کی طرف سے "یمن" کے والی ہیں اس لیے زکوٰۃ وصول کریں اور حقداروں میں تقسیم کریں (۲) والیانِ ریاست کی رہبری کے لیے بنفس نفیس زکوٰۃ کے نصاب و حساب کی ایک کتاب املا کرائی (۳) ——— جو احکام زکوٰۃ کے لیے بنیاد اور اساس کا درجہ رکھتی ہے، اہلِ ثروت اور عاملین زکوٰۃ دونوں کے لیے اخلاقی ضابطے مقرر فرمائے اہلِ ثروت سے کہا کہ وہ عمال کے لیے تکدر کا باعث نہ بنیں اور عاملین اس حال میں ان کی آبادیوں سے آئیں کہ ان سے خوش رہیں (۴) اور عاملین کو ہدایت فرمائی کہ زکوٰۃ میں مال کا عمدہ حصہ وصول کرنے پر جبر نہ کریں (۵) نہ لوگوں کو دور دور تک اپنے مویشی اور سامان لانے پر مجبور کریں (۶) ظاہر ہے کہ ان سارے احکام اور ہدایات کی اصل بنیاد یہی ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی اور حقداروں تک پہنچانا امت کے ایک اجتماعی نظام اور مرکز کے تحت ہونا چاہیے۔

(۱) بدائع الصنائع ۳۵/۲ (۲) ابن ماجہ عن ابن عباس ۱/ ۱۲۷ باب فرض الزکوٰۃ

(۳) ترمذی باب ماجاء فی زکوٰۃ الابل والغنم ۱/ ۱۳۵-۱۳۶ عن سالم عن ابیہ

(۴) ابوداؤد عن جابر بن عتیک ۱/ ۲۲۴ باب رضا المصدق

(۵) ابن ماجہ عن ابن عباس ۱/ ۱۲۷ باب فرض الزکوٰۃ

(۶) ابوداؤد عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ۱/ ۲۲۵ باب این تصدق الاموال

آپ ﷺ کے بعد عہد صحابہ میں بھی اس پر عمل رہا بلکہ حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں جب بعض لوگوں نے خلیفہ کو زکوٰۃ حوالہ کرنے سے انکار کیا تو آپؓ نے ان سے جہاد فرمایا، اس سے استدلال کرتے ہوئے علامہ ماوردی نے ان لوگوں سے جہاد کرنے کی اجازت دی ہے جو اسلامی حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کریں ولہ ...... **ان یقاتلهم علیها اذا امتنعوا من دفعها کما قاتل ابوبکر.** (۱) کاسانی نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ سے آج تک زکوٰۃ کا یہی اجتماعی نظام قائم ہے۔ (۲)

اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ

البتہ فقہاء نے حکومتِ اسلامی کی طرف سے زکوٰۃ کی وصولی کے سلسلے میں اموالِ زکوٰۃ کی دو قسمیں کی ہیں: اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ "اموالِ ظاہرہ" وہ اموال ہیں جن کا اخفاء ممکن نہ ہو، جیسے کھیتیاں، پھل، مویشی، اموالِ باطنہ وہ ہیں جن کو چھپایا جانا ممکن ہو جیسے سونا، چاندی اور اموالِ تجارت، (۳) تاہم ان اموالِ باطنہ کا بھی کسی صورت اظہار ہو جائے جیسے تجار مال تجارت کی حیثیت سے ان کو لے کر گذریں اور زکوٰۃ و خراج وصول کرنے والے "عاشر" پر سے گذر ہو جائے تو اب یہ بھی "اموالِ ظاہرہ" کے درجہ میں ہوں گے، (۴) حضرت ابو بکرؓ کے متعلق مروی ہے کہ جب لوگوں کو ان کے وظائف ادا کرتے تو اسی وقت تحقیق فرماتے کہ ان پر زکوٰۃ تو واجب نہیں زکوٰۃ واجب ہوتی تو وظیفہ ہی سے وضع فرمالیتے۔ (۵) موجودہ زمانے میں بینک میں جمع شدہ نقد رقوم یا بینک میں محفوظ کئے گئے سونے اور چاندی، "مال ظاہر" ہی کہلائیں گے، اس لیے کہ ان کی تحقیق و تفتیش کے لیے لوگوں کے اندرونی امور میں دخل دینا نہیں پڑے گا۔

رسول اللہ ﷺ، حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اپنی خلافت کے ابتدائی زمانے میں ان دونوں طرح کے اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیتے تھے۔ علامہ کاسانی کا بیان ہے:

---

(۱) الاحکام السلطانیہ ۱۱۳ الباب الحادی عشر (۲) بدائع الصنائع ۳۵/۲
(۳) الاحکام السلطانیہ ۱۱۳ (۴) بدائع الصنائع ۳۵/۲
(۵) موطا امام مالک ۲۷۲ الزکوٰۃ فی العین من الذهب والورق

واما المال الباطن الذی یکون فی المصر فقد قال عامة مشائخنا ان رسول الله ﷺ طالب بزکاته وابوبکر وعمر طالبا وعثمان طالب زماناً. (۱)

مالِ باطن جو شہر میں ہوتا، ہمارے اکثر مشائخ کی رائے ہے کہ حضور ﷺ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ اس کی زکوٰۃ وصول کرتے رہے ہیں، حضرت عثمانؓ بھی ایک عرصہ تک ان اموال کی زکوٰۃ طلب کیا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عامل حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھ کر ہدایت فرمائی کہ مالِ تجارت کی زکوٰۃ بھی وصول کریں اور اس کی شرح دو سو درہم پر پانچ درہم ہو (۲) عہد عثمانی میں جب بیت المال میں مال کی کثرت ہو گئی۔ اموالِ باطنہ کی تفتیش و تحقیق میں دقت ہونے لگی اور لوگوں کو پریشانی ہونے لگی تو حضرت عثمان غنیؓ نے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کی ادائیگی خود اصحاب مال کو تفویض کر دی (۳) ان تصریحات سے واضح ہے کہ:

- جن اموال کی تحقیق کے لیے لوگوں کی نجی زندگی میں دخل دینا نہ پڑتا ہو وہ "اموالِ ظاہرہ" ہیں۔
- جن اموال کی تحقیق و تفتیش کے لیے نجی زندگی میں دخل دینا پڑے وہ "اموالِ باطنہ" کہلاتے ہیں۔
- اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرنا "امیر" کا حق ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی کے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ ادا کرنے کا حق اصحابِ مال کو تفویض کرنے کے بعد اب اموالِ باطنہ کی وصولی کا حق امیر کو رہا یا نہیں اور خود ان اصحاب مال کو بہ طور خود اپنی زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے یا امیر کے حوالے کرنی چاہیے؟

اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کون وصول کرے؟

اس سلسلے میں دل جس رائے پر مطمئن ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ "اموالِ باطنہ" کی زکوٰۃ بھی

---

(۱) بدائع الصنائع ۳۵/۲ (۲) کتاب الخراج: یحییٰ بن آدم ص: ۱۷۳
(۳) بدائع الصنائع ۳۵/۲

اصولی طور پر "امیر" ہی کا حق ہے، کیونکہ قرآن مجید نے بلا کسی تفریق کے مطلق آپ ﷺ کو زکوٰۃ وصولی کرنے کا حق دیا ہے، امام طحاوی نے اپنے مخصوص استدلالی اسلوب میں اس پر خوب روشنی ڈالی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ بھی وصول کی ہے اور اس سے کسی نے اختلاف نہیں کیا تو یہ "اجماع" کے درجہ میں ہے، دوسرے قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ جب مویشی اور پھلوں کی زکوٰۃ امام وصول کرے گا تو دوسرے اموال سونا، چاندی اور مالِ تجارت کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق بھی اسے حاصل ہونا چاہیے، اس تفصیل کے بعد فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ، ابو یوسفؒ اور محمدؒ کی یہی رائے ہے، **وهذا كله قول ابي حنيفة و ابي يوسف ومحمد** (۱) ہاں حضرت عثمان غنیؓ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خود "امیر" اصحابِ مال کو یہ حق تفویض کردے کہ وہ خود زکوٰۃ ادا کرلیں، تو ایسی صورت میں ان کو خود ہی زکوٰۃ ادا کرلینی چاہیے۔

البتہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کے لیے امیر حکم دینے پر اکتفا کرے گا، جو لوگ اپنی زکوٰۃ لاکر دیں قبول کرلے گا، تحقیق وتفحص اور لوگوں کے نجی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا، علامہ کاسانی نے شیخ ابو المنصور ماتریدی سے نقل کیا ہے کہ قرونِ خیر میں مویشی اور اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے خود امیر عمال کو بھیجا کرتے تھے۔ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے عمال بھیجے نہ جاتے تھے۔ لوگ خود لاکر زکوٰۃ حوالہ کرتے تھے، ان کی زکوٰۃ قبول کرلی جاتی تھی، یہ نہیں دریافت کیا جاتا کہ ان کے پاس کتنا مال موجود ہے؟ (۲) جہاں اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ وصول کرنے میں اس تجسس اور تفحص کی ضرورت نہ پڑے، مثلاً راہداریوں پر وصول زکوٰۃ کے لیے چوکیاں قائم کی جائیں اور وہاں سے لوگ "اموالِ باطنہ" لے کر گذریں تو ان کی زکوٰۃ بھی وصول کی جائے گی۔ **وكما ياخذ العاشر صدقات الاموال الظاهرة ياخذ صدقات الاموال الباطنة التى تكون مع التاجر** (۳) اسی طرح اگر کسی علاقے کے بارے میں بہ تحقیق یہ بات معلوم ہوجائے کہ وہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ نہیں ادا کرتے ہیں تو اب امیر ان سے زکوٰۃ ادا کرنے کا مطالبہ کرے گا (۴) تاکہ ایک فریضۂ اسلامی کا احیاء ہو اور اسلام کا ایک اہم رکن پامال ہو کر نہ رہ جائے۔

---

(۱) شرح معانی الآثار، کتاب الزکوٰۃ ۱/۳۱۴ (۲) بدائع الصنائع ۲/۳۶
(۳) ہندیہ ۱/۱۸۳ (۴) فتح القدیر ۱/۴۸۸، بدائع الصنائع ۲/۷

امیر کب زکوٰۃ وصول کرے؟

"امیر" کب زکوٰۃ وصول کرنے کا حقدار ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء نے جو شرطیں ذکر کی ہیں وہ عمومی نوعیت کی ہیں یعنی اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہو، مال موجود ہو، مالک موجود ہو، کسی اور عامل نے زکوٰۃ وصول نہ کی ہو، وغیرہ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور شرط فقہاء نے حمایت وحفاظت کی نقل کی ہے، علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

> **منها وجود الحماية من الامام حتى ظهر اهل البغى على مدينة من مدائن اهل العدل اوقرية من قرٰهم وغلبوا عليها فاخذوا صدقات سوائمهم وعشور اراضيهم وخراجها ثم ظهر عليهم امام العدل لا ياخذ منهم ثانيا لان حق الاخذ للامام لاجل الحفظ والحماية ولم يوجد.** (۱)
>
> ان شرطوں میں ایک امام کی طرف سے تحفظ کا پایا جانا ہے، یہاں تک کہ اہلِ بغاوت اہلِ عدل فرماں رواؤں کے کسی شہر یا گاؤں پر غلبہ پالیں اور ان کے مویشی کی زکوٰۃ اور اراضی کا عشر وخراج وصول کرلیں، پھر امام عادل کو غلبہ حاصل ہوجائے تو وہ ان سے دوبارہ زکوٰۃ وعشر نہیں وصول کرے گا اس لیے کہ امام کے لیے وصولیٔ زکوٰۃ کا حق حفاظت وصیانت کی وجہ سے تھا اور وہ نہیں پایا گیا۔

لیکن غور کیا جائے تو "حمایت وحفاظت" کی حیثیت ایک حکمت ومصلحت کی ہے، کسی لازمی شرط کی نہیں، اصل یہ ہے کہ امیر کو تمام مسلمانوں پر عمومی ولایت حاصل ہے، یہ ولایت شرعیہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ زکوٰۃ کے نظام میں اجتماعیت کو برقرار رکھنے کے لیے امیر کو زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا حق حاصل ہو، فقہاء احناف کے سرخیل امام سرخسی لکھتے ہیں۔ **هذا حق مالى يستوفيه الامام بولاية شرعية** (۲) یہ حق مالی ہے، جس کو امام ولایت شرعی کی بنا پر حاصل کرتا ہے، کاسانی کا منشا صرف ایک خاص صورت سے متعلق ہے کہ جہاں "امیر عادل" کی حدود ولایت میں فاسق وفاجر لوگ غلبہ حاصل کرلیں اور وہ بہ جبر اصحاب مال سے زکوٰۃ وصول کرلیں تو اب وہ دوبارہ امیر عادل کو زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے اس لیے کہ وہ ان کو

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۳۶ (۲) المبسوط ۲/۱۶۲

زکوۃ ادا کرنے میں معذور تھے۔ اگر امیر عادل نے اپنی رعایا کی ان لوگوں سے حفاظت کی ہوتی اور انھوں نے بہ جبر ان سے زکوۃ وصول نہ کی ہوتی، تو یہ ضرور "امیر" کو زکوۃ ادا کرتے، پس حفاظت وصیانت، زکوۃ وصول کرنے کے لیے شرط نہیں ہے، بلکہ کسی نے جبراً زکوۃ وصول کرلی ہو تو امیر کو مکرر زکوۃ ادا کرنا اس کے ذمہ نہیں ہے اسی کو عالم گیری میں یوں کہا گیا ہے:

اذاغلب الخوارج علی بلد واخذوا زکوۃ سوائمهم فانه لاشئی علیهم . (۱)

اگر کسی شہر پر باغی غالب آجائیں اور ان کے مویشیوں کی زکوۃ وصول کرلیں تو اب ان پر مزید دوبارہ زکوۃ کی ادائیگی نہیں۔

مسلمانانِ ہند کے لیے راہِ عمل

ان تفصیلات کی روشنی میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے راہِ عمل متعین کی جاسکتی ہے ایسے ممالک کے بارے میں جہاں باگِ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہو، فقہا نے لکھا ہے کہ وہاں بھی مسلمان خود کو اجتماعیت اور تنظیم کے اسلامی مزاج سے مستغنی نہ سمجھیں اور باہمی اتفاق سے کسی امیر کو منتخب کرلیں۔ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

اذا لم یکن سلطان ولا من یجوز التقلد منه کما هو بعض بلاد المسلمین غلب علیهم الکفار کقرطبة فی بلاد المغرب الآن وبلنسیة وبلاد الحبشة ...... یجب علیهم ان یتفقوا علی واحد منهم یجعلونه والیا فیولی قاضیا اویکون هوالذی یقضی بینهم . (۲)

جب سلطان یا ایسا کوئی شخص نہ ہو جس کی طرف سے والی کا تقرر درست ہو، جیسا کہ بعض مسلم ریاستوں مثلاً بلادِ مغرب میں قرطبہ بلنسیہ اور بلاد حبشہ کا حال ہے، جہاں کفار غالب آگئے ہیں —— ایسے علاقوں میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے میں سے ایک کی امارت پر متفق ہوجائیں اور ان کو "والی" بنالیں، وہ قاضی مقرر کرے یا خود لوگوں کے درمیان

(۱) ہندیہ ۱/۱۸۴
(۲) فتح القدیر ۶/۳۶۵

قضاء کا فریضہ انجام دے۔

اس طرح کی تصریحات فقہاء کی اکثر کتابوں میں موجود ہیں اور ان کی بنیاد قرآن و حدیث کی ان ہدایات پر ہے جن میں مسلمانوں کو "جماعت" بن کر رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

انہی احکام کی تعمیل میں ہندوستان کے اکابر علماء "امارت شرعیہ" کے قیام کا فتویٰ دیا اور سب سے پہلے صوبہ بہار کی قسمت میں یہ سعادت وخوش بختی آئی کہ وہاں یہ نظام شرعی قائم ہوا اور حضرت مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی سرکردگی میں قاضیوں کا بھی تقرر ہوا اور بیت المال کا قیام بھی عمل میں آیا۔

پس، جہاں کہیں اس طرح امارت شرعی قائم ہوجائے وہاں کے مسلمانوں کو چاہیے کہ اگر اس کے تحت "بیت المال" قائم ہو تو اس میں اپنی زکوۃ جمع کریں، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ، پھلواری شریف پٹنہ میں معمول یہ ہے کہ جو لوگ کسی حقدار کو بطور زکوۃ دینا چاہتے ہیں، "بیت المال" میں داخل کرکے اتنا اس میں سے لے لیتے ہیں یا اس کی اجازت حاصل کرلیتے ہیں، یہ صورت شرعاً درست ہے، بلکہ فقہی کتابوں کی بعض عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بہ امید منظوری پہلے اہل استحقاق پر خرچ کردے، پھر اجازت حاصل کرلے، تو اس میں بھی قباحت نہیں، فتاویٰ عالم گیری میں ہے:

لواجازالامام اعطاه لم یکن به باس لأنه لواذن الامام فی الابتداء ان یعطی الفقراء بنفسه جاز فکذا اذا اجاز بعد الاعطاء . (۱)

اگر امام اس کے زکوۃ دینے کو جائز کردے تو کوئی مضائقہ نہیں، اس لیے کہ اگر امام پہلے ہی صاحب سرمایہ کو اجازت دے دیتا کہ وہ خود فقراء کو زکوۃ ادا کردے تو جائز ہوتا، لہٰذا اگر زکوۃ ادا کرنے کے بعد اجازت دیدے تب بھی جائز ودرست ہونا چاہیے۔

جن علاقوں میں امارت شرعی کا نظام قائم نہ ہو، وہاں بھی زکوۃ کی وصولی اور زکوۃ کی تقسیم کا اجتماعی نظام کسی اور صورت میں قائم کرلیا جائے تو یہ بات بہر حال بہتر ہوگی کہ اس صورت میں کسی نہ کسی درجہ اجتماعیت تو باقی رہے گی، البتہ ایسی انجمنیں اور کمیٹیاں شرعاً امیر اور

(۱) ہندیہ ۱/۱۸۳

امیر کے تحت کام کرنے والے "بیت المال" کے حکم میں نہ ہوں گی۔

بیت المال

زکوٰۃ کی تقسیم و وصولی کے اس اجتماعی نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس اسلامی "بیت المال" کی بابت بھی ضروری وضاحت کردی جائے، جن کا ذکر ہماری اکثر کتب فقہ میں زکوٰۃ، عشر و خراج اور مالِ غنیمت وغیرہ کے ذیل میں آتا ہے، عہد نبوی ﷺ میں تو معمول تھا کہ جو آتا، اسی وقت تقسیم ہو جاتا، جمع رکھنے کی نوبت ہی نہ آتی، یہی معمول خلافت صدیقی میں بھی قائم رہا، عہد فاروقی میں جب فتوحات کی کثرت ہوئی اور عالم اسلام کی سرحدیں بہت وسیع ہوگئیں تو ایک ایسے محکمہ کی ضرورت محسوس ہوئی جو مملکت کی آمدنی اور اخراجات کا حساب و کتاب رکھے۔ رجسٹر مرتب ہوں، فوجیوں اور عہدیداروں کے نام لکھے جائیں، ملازمین کی تنخواہیں اور وظائف درج ہوں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس طرف توجہ فرمائی اور اس کی تکمیل کرائی(۱) اس طرح "بیت المال" کی بنیاد اصولی طور پر تو زکوٰۃ و عشر کی فرضیت اور جزیہ و خراج کے احکام کے ساتھ ہی پڑ چکی تھی، مگر اس کی تکمیل و تنظیم ان ہی حضرت عمرؓ کے ذریعہ ہوئی جن کو اسلام کی تاریخ میں متعدد اہم باتوں اور کاموں میں پہل کا شرف حاصل ہوا۔

آمد و خرچ کے مدات اور شعبے

بیت المال میں آمدنی اور خرچ کے مدات کیا کیا ہوں گے؟ اس کی وضاحت ان شعبہ جات سے ہوتی ہے، جو فقہاء نے بیت المال کے مقرر کیے ہیں، مدات آمد و خرچ بنادی طور پر چار ہوں گے:

۱ - مال غنیمت اور زمین سے نکلنے والی کانوں اور دفینوں کا پانچواں حصہ، یہ یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ ہوں گے۔

۲ - زکوٰۃ و عشر، جن کا مصرف خود قرآن مجید نے متعین کردیا ہے اور "مصارف زکوٰۃ" کے تحت ان کا ذکر آچکا ہے۔

(۱) السیاسۃ الشرعیہ ۱۹

۳ - خراج و جزیہ اور غیر ملکی (حربی) تاجروں سے لیا جانے والا ٹیکس، یہ رقم رفاہی امور مثلاً سرحدوں کی حفاظت و مورچہ بندی، قلعوں کی تعمیر، اسلحہ سازی، راستوں میں حفاظتی چوکیوں کا قیام، پلوں کی تعمیر، نہر و آب رسانی کے نظم، قضاۃ معلمین اور دوسرے سرکاری ملازمین کی تنخواہ اور وظائف وغیرہ، پر خرچ کی جائے گی۔

۴ - لاوارثوں کا متروکہ اور ایسا گراپڑا (لقطہ) سامان جس کا مالک معلوم نہ ہوسکے، اس رقم سے غریب مریضوں کے اخراجات، دوا و معالجہ، تجہیز و تکفین اور بے روزگار اور بے سہارا لوگوں کے اخراجات وغیرہ پورے کیے جائیں۔(۱)

ان تمام مدات کے الگ الگ شعبے قائم کیے جائیں گے، اگر کسی مد میں ضرورت ہو اور اس مد کی رقم موجود نہ ہو، تو وقتی طور سے دوسری مد سے رقم لے کر اس مد میں استعمال کی جائے گی اور اس مد کی رقم آنے کے بعد دوسری مد کو ادا کردی جائے گی،(۲) ظاہر ہے کہ یہ مدات آمد صرف اس زمانے کی محدود ضروریات اور وسائل اور ذرائع کو ملحوظ رکھ کر فقہاء نے مقرر کیے تھے، اب ان میں خاصی وسعت ہوگئی ہے، لیکن ان بنیادی مدات کو سامنے رکھ کر ان کے تعین میں روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔

نظام اجتماعی سراپا رحمت

اسلام کی تمام تعلیمات اور شریعت کی تمام ہدایات سراپا رحمت ہیں۔ زکوٰۃ اور بیت المال کا یہ اجتماعی نظام مسلمانوں کے سماج کے لیے ایک نعمت عظمیٰ اور کتنی ہی مادی، اخلاقی اور روحانی فوائد کا حامل تھا۔ زکوٰۃ کے اجر کو احسان جتانا اور محتاجوں کو طعنہ دینا، ضائع کردیتا ہے۔ بیت المال میں زکوٰۃ کی ادائیگی از خود ان روحانی محرومیوں سے حفاظت کرتی ہے، زکوٰۃ کی باقاعدہ وصولی، زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے خود محرک بن جاتی ہے اس سے قوم میں اجتماعیت اور ایک دوسرے کی کفالت کا مزاج پیدا ہوتا ہے، مجبوروں، معذوروں، یتیموں، بیواؤں، قرض داروں اور حاجت مندوں، مسافروں اور بے ٹھکانوں کے لیے ایک قانونی ٹھکانہ اور پناہ گاہ فراہم کرتا ہے۔ زکوٰۃ لینے والوں کو بے وقاری اور بے آبروئی سے بچاتا ہے، گداگری کا سدِ باب کرتا ہے اور افراد و اشخاص کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی خوئے بد سے اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے

(۱) دیکھیے: المبسوط ۳/۱۷-۱۸ ہندیہ ۱/۱۹۱-۱۹۰ (۲) ردالمحتار ۲/۵۷

والی دناءت، اخلاقی پستی اور گراوٹ سے حفاظت کرتا ہے ـــــ کاش، مسلمانانِ ہند اس طرف توجہ کریں اور اپنی تنگنائیوں سے پرے اٹھ کر امت کی آفاقیت اور وسعت میں خود کو سمونے کے لیے تیار ہو جائیں۔

باب: ٦

زکوٰۃ کی ادائیگی

زکوٰۃ کی ادائیگی

زکوٰۃ کے فرض ہونے پر تو اجماع ہے، لیکن کیا نصاب زکوٰۃ پر سال گذرنے کے بعد فی الفور زکوٰۃ ادا کر دینی واجب ہے، یا اس میں تاخیر بھی کی جا سکتی ہے؟ اس میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک فوری ادا کی جانی چاہیے، اگر ادائیگی زکوٰۃ پر قدرت کے باوجود تاخیر کی تو گنہ گار ہوگا، (۱) مشہور حنفی فقیہ حاکم شہید نے امام ابویوسفؒ اور محمدؒ سے بھی یہی رائے نقل کی ہے، (۲) اور خلاصۃ الفتاویٰ میں اسی رائے کو زیادہ صحیح قرار دیا گیا ہے، (۳) بلکہ امام محمدؒ نے تو (بلا عذر) تاخیر کرنے والے کی گواہی کو بھی ناقابلِ قبول قرار دیا ہے، (۴) امام طحاویؒ نے خود امام ابو حنیفہؒ سے نقل کیا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں تاخیر مکروہ ہے اور شامی نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ جب مطلق مکروہ بولا جائے تو مکروہ تحریمی مراد ہوتا ہے، اس لیے تاخیر مکروہ تحریمی ہے۔ (۵)

زکوٰۃ کے فی الفور واجب ہونے کا قول عام طور پر امام کرخیؒ سے منقول ہے، امام ابو بکر جصاص رازیؒ اور ابو عبد اللہ ثلجی نے نقل کیا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی فی الفور واجب نہیں (۶) اسی کو حصکفی نے لکھا ہے کہ زکوٰۃ عمری فریضہ ہے، یعنی عمر بھر میں کبھی بھی زکوٰۃ ادا کی جا سکتی ہے۔ (۷)

---

(۱) شرح مہذب ۳۳۵/۵ المغنی ۲۸۹/۲ (۲) تاتار خانیہ ۲۱۷/۲
(۳) خلاصۃ الفتاویٰ ۲۳۴/۱ (۴) بدائع الصنائع ۳/۲
(۵) رد المحتار ۱۳/۲ (۶) بدائع الصنائع ۳/۲
(۷) در مختار علی ہامش الرد ۱۲/۲

مگر واقعہ یہ ہے کہ پہلی رائے زیادہ صحیح ہے کہ یہ مالکیہ، شوافع اور حنابلہ سے تو منقول ہے ہی، خود حنفیہ میں ائمہ ثلاثہ سے مروی ہے، یہ قول علامہ ابن ہمامؒ :

فقد ثبت عن الثلاثة وجوب فورية الزكوة .(۱)

زکوۃ کا مصرف محتاجوں کو قرار دیا گیا ہے۔ ابن ہمام کا خیال ہے کہ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ زکوۃ کی فی الفور ادائیگی واجب ہے کیونکہ حاجت پہلے سے موجود ہے جو اس بات کی متقاضی ہے کہ زکوۃ بھی بہ جلد ادا کی جائے،(۲) حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے زکوۃ کے فی الفور واجب الادا ہونے کے لیے ان روایات سے استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ نے نماز عصر ادا کی اور بلا تاخیر گھر میں داخل ہوئے اور واپس آئے اور فرمایا کہ میں نے زکوۃ کا ایک ٹکڑا (تبرا عن الصدقة) گھر میں چھوڑ آیا تھا۔ میں نے اس حال میں رات گذارنا بہتر نہ سمجھا کہ وہ گھر میں رہے، اس لیے تقسیم کر آیا، (بخاری عن عقبہ بن حارث) نیز حضرت عائشہؓ نے آپ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ زکوۃ جب بھی کسی مال کے ساتھ مخلوط ہوگی، مال کو ضائع کر کے رہے گی،(۳) جن حضرات نے زکوۃ کی ادائیگی میں تاخیر کو بھی روا رکھا ہے ان کا خیال ہے کہ زکوۃ کے لیے امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، اور یہ فی الفور کسی چیز کے مطالبہ کو نہیں بتلاتا۔ لیکن محققین کا خیال ہے کہ امر نہ کسی حکم کی تعمیل میں عجلت کو بتلاتا ہے نہ تاخیر کے جواز کو ان مطلق الامر لايقتضى الفور ولا التراخى (۴) اس لیے جہاں اس سے زکوۃ کی فوری ادائیگی کے حکم پر استدلال درست نہیں، وہیں اس میں تاخیر کا جواز ثابت کرنا بھی صحیح نہیں، لیکن خیر میں عجلت و مسابقت کا حکم عاملین زکوۃ کے مطالبہ پر ان کو زکوۃ حوالہ کرنے کی تاکید، فقراُ اور مصارف زکوۃ کی پہلے سے موجودگی اور فقہاء امت کا قریب قریب اتفاق اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ زکوۃ فرضیت اور قدرت و امکان کے بعد بلا تاخیر واجب الاداء ہے۔

تاہم خیال رہے کہ ادائیگی زکوۃ میں تاخیر کی وجہ سے زکوۃ معاف نہیں ہوتی اور زکوۃ جب بھی ادا کی جائے وہ ادا ہی ہوتی ہے، گویا اس مسئلہ میں زکوۃ کو بہت کچھ

---

(۱) فتح القدیر ۲/۱۱۴ (۲) حوالہ سابق

(۳) بخاری، کتاب العشر والزکوۃ ۱۴۰ (۴) فتح القدیر ۲/۱۱۴

مشابہت حج کے حکم سے ہے۔(۱)

مال زکوۃ ضائع ہو جائے یا کر دیا جائے؟

نصاب زکوۃ کا مالک ہونے اور اس مال پر سال گذرنے کے بعد، لیکن زکوۃ ادا کرنے سے قبل مال ضائع ہو جائے تو زکوۃ اس کے ذمہ باقی رہے گی یا معاف ہو جائے گی؟ اس مسئلہ میں بھی فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ اور احمدؒ کا قول ہے کہ زکوۃ کی ادائیگی پر قدرت کے باوجود زکوۃ ادا نہ کرے اور مال ضائع ہو جائے تو زکوۃ اس کے ذمہ واجب رہے گی، ہاں، اگر زکوۃ ادا نہ کرنے میں اس کی کوتاہی کو دخل نہ ہو کسی مجبوری کی وجہ سے تاخیر ہوئی ہو، مثلاً مستحق زکوۃ دستیاب نہ ہو۔ مال قریب میں موجود نہ ہو، ابطور زکوۃ جو فرض ہو وہ اس کے پاس نہ ہو اور خرید کرنے کی حاجت ہو،(۲) وغیرہ، پھر نصاب زکوۃ ضائع ہو گیا تو زکوۃ اس سے معاف ہو جائے گی۔(۳)

مالکیہ کو بھی اس سے اتفاق ہے، لیکن ایک نکتہ میں اختلاف کے ساتھ، اور وہ یہ کہ اگر اس کے پاس مویشیوں کا نصاب ہو اور "بیت المال" کی طرف سے محصل وصول زکوۃ کے لیے نہ آیا ہو، تو گو سال گذر چکا تھا لیکن یہ نصاب ضائع ہو جائے تو زکوۃ واجب نہیں،(۴) کیوں کہ ان کے نزدیک مویشی میں زکوۃ کی ادائیگی واجب ہی اس وقت ہوتی ہے جب محصل زکوۃ کی وصولی کے لیے آ چکا ہو۔(۵)

احناف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر قصداً مال کو ضائع کر دے تب تو اس پر ضائع کردہ مال کی زکوۃ واجب ہوگی، لیکن ایسا نہ ہوا ہو، تو چاہے ادائیگی پر قدرت یا بیت المال کے محصل کی طلبی کے باوجود زکوۃ ادا نہ کی ہو، پھر بھی زکوۃ اس سے ساقط ہو جائے گی، البتہ فقہاء احناف میں امام

---

(۱) محقق ابن ہمام کی عبارت کو سامنے رکھ کر فقہاء احناف کے اقوال میں اس مسئلہ میں ایک گونہ تعارض کو دفع بھی کیا جا سکتا ہے کہ مطلق زکوۃ کی ادائیگی فرض ہے اور فوری ادائیگی واجب ہے (فتح القدیر ۲/۱۱۴) گویا "نفی" "فرضیت علی الفور" کی ہے اور "اثبات" "وجوب علی الفور" کا ہے۔ اور گنہ گار ہونے یا ناقابل گواہی ہونے کے لیے تارک فرض ہونا ضروری نہیں، تارک واجب ہونا بھی کافی ہے۔

(۲) مثلاً پانچ اونٹ پر بکری واجب ہے، بکری مالک اونٹ کے پاس موجود نہ ہو اور وہ اس کی خریدی کے لئے کوشاں ہو۔

(۳) المغنی ۲/۸۹-۲۸۸ (۴) المغنی ۲/۲۸۸

(۵) بدایۃ المجتہد ۱/۲۴۹

کرخی کا خیال ہے کہ "محصّل بیت المال" کے مطالبہ کے باوجود ادا نہ کرے تو وہ زکوٰۃ کا ضامن ہوگا۔(۱) ـــــ احناف کا خیال ہے کہ زکوٰۃ واجب کرنے میں شریعت نے مالکین کی سہولت اور آسانی کو ملحوظ رکھا ہے اور مال کے ضائع ہو جانے کے باوجود زکوٰۃ کے واجب قرار دینے میں بجائے سہولت کے مشقت اور دشواری ہے۔ دوسرے فقہاء کا خیال ہے کہ جیسے انسان کے ذمہ دوسرے دیون اور واجبات ہوتے ہیں، اسی طرح زکوٰۃ بھی فقراء و مساکین کا دَین ہی ہے جو اس کے ذمہ واجب ہے، پس جیسے انسان خریدے ہوئے سامان کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے اس کی قیمت اور قرض پر حاصل کی ہوئی شی کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے اس کے بدل کی ادائیگی سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ یہی حکم فقراُو مساکین کے اس "دَین" کا بھی ہوگا۔ اگر کوئی شخص پورا مال صدقہ کردے تو پورے مال کی، اور نصاب کا کچھ حصہ صدقہ کردے تو اتنے حصہ کی زکوٰۃ اس سے معاف ہو جائے گی، گو اس نے زکوٰۃ کی نیت نہ کی ہو، (۲) شوافع اور دوسرے فقہاء کے نزدیک اس صدقہ نفل سے زکوٰۃ معاف نہ ہوگی۔ اور وہ اپنی جگہ واجب رہے گی۔(۳)

البتہ "صدقہ فطر" مال کے ضائع ہونے کی وجہ سے خود حنفیہ کے یہاں بھی معاف نہیں ہوگا۔ علامہ کاسانی نے زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر میں اس طرح فرق کیا ہے کہ "صدقۃ الفطر" کا تعلق "انسانی ذمہ" سے ہے اور وہ مال کے ضائع ہونے کے بعد بھی باقی ہے، جب کہ زکوٰۃ خود مال سے متعلق ہے لہٰذا مال ضائع ہو جائے تو زکوٰۃ بھی واجب نہیں رہے گی، (۴) تاہم علامہ کاسانی کی اس توجیہ پر یہ شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ زکوٰۃ کا تعلق اگر بعینہ مال سے ہوتا تو پھر اس "مال" کی بجائے اس کی قیمت کے ذریعہ زکوٰۃ کی ادائیگی درست نہیں ہوتی۔ حالانکہ حنفیہ کے یہاں جائز ہے اور مال کے اس حصہ میں جس سے زکوٰۃ متعلق ہو چکی ہے، اللہ کا اور اس کے اصحاب حاجت بندوں کا حق متعلق ہو جانے کی وجہ سے تصرف جائز نہیں ہوتا، مگر ایسا بھی نہیں ہے۔

مال زکوٰۃ کا کچھ حصہ ضائع ہو جائے

یہاں ایک اور مسئلہ قابل توجہ ہے، اگر پورا مال زکوٰۃ ضائع ہو گیا تب تو سرے سے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، لیکن اگر نصاب زکوٰۃ کا کچھ حصہ ضائع ہو جائے تو اسی تناسب سے زکوٰۃ بھی

(۱) تاتارخانیہ ۲/ ۲۹۳ (۲) ہدایہ مع الفتح ۲/ ۲۷-۱۲۶
(۳) المغنی ۲/ ۲۶۵ (۴) بدائع الصنائع ۲/ ۷۵

ساقط ہو جائے گی۔(۱) نقد رقم، سونا چاندی اور مال تجارت میں تو اس کا حساب آسان ہے مگر بعض صورتیں ایسی ہیں کہ شریعت نے ایک مقررہ تعداد اور دوسری تعداد کے درمیان زکوٰۃ معاف رکھی ہے جس کو فقہاء "عفو" کہتے ہیں، مثلاً ایک شخص کے پاس پانچ اونٹ ہیں تو زکوٰۃ میں ایک بکری واجب ہوتی ہے، پھر چھ سے نو اونٹوں تک زکوٰۃ کے لیے کوئی اضافی بکری واجب نہیں، یہ حصہ "عفو" ہے، جس کو "وقص" بھی کہا جاتا ہے، اب کوئی شخص نو اونٹوں کا مالک تھا۔ سال گذرنے کے بعد چار ضائع ہو گئے، پانچ موجود ہیں تو آیا ایک بکری کو انہی پانچ اونٹوں کی زکوٰۃ تصور کیا جائے، اور وہ اس کے ذمہ واجب ہو، یا ایک بکری نو اونٹوں کے مقابلہ تھی اور چار اونٹوں کے مقابلہ آنے والا حصہ منہا کر کے بکری کا باقی حصہ جو "نو میں سے پانچ ہوگا" ادا کرے گا؟ امام ابوحنیفہؒ اور ابو یوسفؒ کا عمل پہلی بات پر ہے اور امام محمدؒ اور امام زفر کا دوسری بات پر، (۲) پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

مالک نصاب کی وفات

"نصاب زکوٰۃ" کے ضائع ہو جانے سے قریبی دوسرا مسئلہ خود مالک نصاب کی وفات کا ہے، زکوٰۃ واجب ہو چکی، سال گذر چکا مگر زکوٰۃ ادا کرنے میں تاخیر کی یہاں تک کہ اس شخص کی موت واقع ہو گئی، تو اب کیا اس کے مالِ متروکہ میں سے زکوٰۃ ادا کی جائیگی؟ مالکیہ و شوافع اور حنابلہ کا خیال ہے کہ مالک کی موت کی وجہ سے زکوٰۃ معاف نہیں ہوگی اس لیے کہ دوسرے دیون کی طرح یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک دَین ہی ہے جو اس کے ذمہ ہے، چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کا دَین ادائیگی کا زیادہ حقدار ہے "دین اللہ احق ان یقضی بہ" لہٰذا متوفی نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو، بہرحال اس کے متروکہ میں سے دوسرے اہلِ حق کے حقوق کی ادائیگی کی طرح یہ حق بھی ادا کیا جائے گا۔(۳)

احناف کے یہاں مالک نصاب کی موت سے زکوٰۃ معاف ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں فقہاء نے جو تفصیل لکھی ہے وہ اس طرح ہے:

۞ متوفی نے اموال باطنہ (سونا، چاندی وغیرہ) کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تھی۔ تو ورثہ پر اس کی

(۱) بدائع الصنائع ۲/ ۲۳ (۲) حوالہ سابق، تاتارخانیہ ۲/ ۲۹۳
(۳) شرح مہذب ۵/ ۳۳۷، المغنی ۲/ ۲۸۹

ادائیگی واجب نہیں۔

● اموال ظاہرہ (مویشی وغیرہ) کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تھی، تو بیت المال کی طرف سے آنے والا محصل ورثا کو اس کی زکوٰۃ ادا کرنے پر مجبور نہ کرے گا۔

● اگر متوفی نے اپنے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرنے کی وصیت کر دی تھی تو بالاتفاق اس کے مال میں سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

● لیکن یہ وصیت بھی عام قانون وصیت کے مطابق متروکہ کے ایک تہائی ہی میں نافذ کی جائے گی، اگر زکوٰۃ کی مقدار اس سے بڑھ جاتی ہے تو یہ ورثہ کی رضامندی پر موقوف ہوگا کہ ایک تہائی سے زائد زکوٰۃ بھی ادا کریں یا نہ کریں؟

● سال کے درمیان مالک نصاب کا انتقال ہو گیا، تو اب از سر نو اس مال پر سال گذرنے کا حساب ہوگا۔(۱)

حنفیہ کا نقطہ نظر ہے کہ زکوٰۃ اصل میں عبادت ہے اور عبادت کی روح اخلاص اور نیت وارادہ ہے، اب ظاہر ہے کہ جو شخص دنیا سے گذر چکا ہو اور وصیت بھی نہ کی ہو اس کی طرف سے نیت وارادہ کا پایا جانا ممکن نہیں، اس لیے اس کی طرف سے زکوٰۃ کی ادائیگی ممکن ہی نہیں ہے۔
حنفیہ کی دلیل بڑی قوی ہے، لیکن دوسرے فقہاء کی بھی اس بات میں وزن ہے کہ زکوٰۃ ایک مالی عبادت ہے اور اس میں "حج" کی طرح دوسرے کی طرف سے نیابت اور قائم مقامی کی گنجائش ہے، نماز وروزہ بدنی عبادت ہے اس لیے اس میں نیابت درست نہیں، جیسے کہ زکوٰۃ کے متعلق وصیت "قابل عمل" ہے اور نماز وروزہ میں وصیت مفید نہیں۔ پس زکوٰۃ کو دوسری عبادات پر قیاس کرنا محل نظر ہے، واللہ اعلم

پیشگی زکوٰۃ کی ادائیگی

زکوٰۃ میں تاخیر کی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی میں "عجلت" بھی ایک اہم مسئلہ ہے، کوئی شخص ابھی نصاب زکوٰۃ کا مالک ہی نہ ہوا ہو اور آئندہ متوقع غنا اور دولت پر زکوٰۃ ادا کرے تو بالاتفاق زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، (۲) مالکِ نصاب ہونے کے بعد ایک سال یا اس سے زیادہ کی پیشگی زکوٰۃ ادا کر دے تو جائز ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ نے حضرت عباسؓ سے پیشگی زکوٰۃ وصول

(۱) تاتارخانیہ ۲/۲۹۶ (۲) المغنی ۲/۲۶۰

کی ہے، (۱) یہ رائے احناف، شوافع اور حنابلہ کی ہے، مالکیہ کے نزدیک جس طرح نماز کا قبل از وقت ادا کر لینا کافی نہیں ہوتا، اسی طرح سال گذرنے سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنی بھی درست نہ ہوگی۔(۲)

البتہ احناف اور دوسرے فقہا کے درمیان بھی ایک نکتہ پر اختلاف ہے، احناف کے ہاں آدمی ابھی ایک ہی نصاب کا مالک ہو لیکن وہ کئی نصاب کی زکوٰۃ اس توقع پر ادا کر دے کہ شاید آئندہ اس کا مالک ہو جائے، مثلاً (۲/۱-۷ تولہ سونا) اس کی ملکیت میں ہے اور زکوٰۃ (۱۰ ریا ۱۵ ر تولہ) کی ادا کر دی تو ایسا کرنا درست ہے اور آئندہ اگر واقعی وہ اتنی مقدار سونے کا مالک ہو گیا تو اب اسے اس زائد مقدار کی زکوٰۃ ادا نہیں کرنی ہوگی ——— حنابلہ وغیرہ کے ہاں اس زائد مقدار کی زکوٰۃ اسے پھر سے ادا کرنی ہوگی اور اس کے مالک ہونے سے پہلے ادائیگی کافی نہ ہوگی۔(۳)

زکوٰۃ کی قبل از وقت اور پیشگی ادائی سے متعلق امام طحاوی نے تین شرطیں ذکر کی ہیں۔

۱ - جس نصاب زکوٰۃ کی ادائیگی پیشگی کی گئی ہے، اس پر سال پورا ہو۔
۲ - اختتام سال پر یہ نصاب مکمل رہے۔
۳ - سال کے درمیان کبھی اس کی نوبت نہ آئے کہ نصاب بالکل ہی ختم ہو جائے۔(۴)

ان میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے تو قبل از وقت ادا کردہ زکوٰۃ "صدقہ نافلہ" ہو جاتی ہے، (۵) قبل از وقت ادائیگی میں سال دو سال کی کوئی قید نہیں دس بیس سال کی بھی ادا کر دے تو حرج نہیں، (۶) احناف کے علاوہ دوسرے فقہا کے ہاں بھی یہی راجح قول ہے۔(۷)

نیت

"عبادات" جتنی بھی ہیں، خدا اور بندے کے تعلق کو ظاہر کرتی ہیں، اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب ہے، وہ بندوں کا قول وفعل نہیں، بلکہ ان کے جذبات اور قلبی کیفیات ہیں، اسی لیے

(۱) ترمذی عن علی حدیث نمبر ۶۷۸ (۲) المغنی ۲/۲۶۰
(۳) فتح القدیر ۲/۱۵۰، المغنی ۲/۲۶۱ (۴) تاتارخانیہ ۲/۲۵۴
(۵) حوالہ مذکور (۶) رد المحتار ۲/۲۷
(۷) المغنی ۲/۲۶۰

"نیت " تمام عبادتوں کے لیے ضروری قرار دی گئی ہے، خود آپ ﷺ کا ارشاد ہے : انما الاعمال بالنیات (اعمال کا مدار نیت پر ہے) زکوۃ بھی من جملہ عبادات کے ہے، اس لیے ضروری تھا کہ اس میں نیت کی جائے، چنانچہ ائمہ اربعہ زکوۃ میں نیت کے ضروری ہونے پر متفق ہیں۔(۱)

یا تو محتاج اور مستحق زکوۃ کو زکوۃ حوالہ کرتے ہوئے نیت کرے یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ زکوۃ کی نیت سے پہلے ہی مال زکوۃ الگ کر لے، پھر اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیتا رہے، اب ہر بار نیت ضروری نہیں ہوگی،(۲) اگر کسی دوسرے شخص کو زکوۃ کا مال دیا کہ وہ مستحقین میں تقسیم کر دے، تو تقسیم کرنے والے کا نیت کرنا ضروری نہ ہوگا، اصل مالک کی نیت کافی ہوگی،(۳) اسی طرح "بیت المال "کو زکوۃ ادا کی تو چاہے بیت المال مستحقین کو دیتے ہوئے نیت نہ کرے، پھر بھی کافی ہوگا۔(۴)

نیت سے مراد ذہن میں زکوۃ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر زکوۃ ادا کرتے وقت دریافت کیا جائے کہ کس مد میں یہ دے رہا ہے تو بے تکلف اور بلا تامل زکوۃ کا نام لے سکے۔(۵)

اگر عین زکوۃ کی ادائیگی کے وقت نہیں، بلکہ اس سے کچھ پہلے زکوۃ کی نیت کرے، جیسے نماز سے کچھ پہلے اس کی نیت کی جاتی ہے، تو یہ نیت بھی زکوۃ ادا کرنے کے لیے کافی ہوگی(۶) اگر یوں نیت کرے کہ اس وقت سے آخر سال تک جو کچھ صدقہ کروں وہ زکوۃ ہوگی، لیکن عین مال دیتے وقت زکوۃ کی علحدہ سے نیت نہ کی تو یہ نیت کافی نہ ہوگی اور زکوۃ ادا نہ ہو پائے گی۔(۷)

فقیر کو پیسے دیدے، اس وقت زکوۃ کی نیت نہ کی، بعد کو نیت کی، تو اگر نیت کے وقت وہ پیسے، "یا سامان دیا ہو" تو سامان، اس کے پاس موجود ہو تو زکوۃ ادا ہو جائے گی ورنہ نہیں، اسی طرح کسی اور شخص کی زکوۃ اس کے مال سے اس کی اطلاع کے بغیر ادا کر دی پھر مالک کو آگاہ کر دیا اور اس نے اس کو قبول کر لیا، تو اگر اس وقت تک وہ مال فقیر کے پاس موجود ہو تب تو زکوۃ ادا ہوگی ورنہ نہیں۔(۸)

---

(۱) بدائع ۲؍۴۰ الافصاح لابن ہبیرہ ۱؍۲۱۰ (۲) المغنی ۲؍۲۶۴
(۳) ہدایہ مع الفتح ۲؍۱۲۵ (۴) المغنی ۲؍۲۶۵
(۵) تاتارخانیہ ۲؍۲۶۵ (۶) المغنی ۲؍۲۶۵
(۷) ہندیہ ۱؍۱۷۱ امام محمدؒ سے ایک قول کافی ہونے کا بھی منقول ہے۔ تاتارخانیہ ۲؍۲۶۶
(۸) ہندیہ ۱؍۱۷۱

کسی شخص کے ذمہ دَین ہو اور اس کو معاف کر دے اور زکوۃ کی نیت کر لے تو یہ نیت کافی نہ ہوگی اور زکوۃ ادا نہ ہو پائے گی،(۱) ہاں اگر نقد زکوۃ اسے دے کر پھر اس سے اپنا قرض وصول کر لے تو اب زکوۃ ادا ہو جائے گی،(۲) اگر کسی اور کے ہاں دین ہو، وہ فقیر سے کہے کہ فلاں شخص سے میرا دین وصول کر لو، وہ تمہارا ہے اور نیت زکوۃ کی کر لے تو یہ جائز ہے،(۳) اگر وہ دَین فقیر وصول کر لے تو زکوۃ ادا ہو جائے گی زکوۃ کی ادائیگی کے لیے اس کی نیت اور جس کو زکوۃ دی جا رہی ہے، اس کے مصرف زکوۃ ہونے کی تحقیق ضروری ہے، اس کا اظہار ضروری نہیں کہ وہ زکوۃ ہی ہے، قرض ہبہ، تحفہ، یا عیدی کے نام پر دیا جائے تاکہ لینے والے کی عزت نفس کو چوٹ نہ لگے اور نیت زکوۃ ادا کرنے کی ہو تو قباحت نہیں، لان المعتبر فیه الدافع وان اجازت وان سماها قرضاً اوهبة فی الاصح .(۴)

اصل مال یا قیمت کے ذریعہ زکوۃ

جس مال میں زکوۃ واجب ہو، کیا خاص اسی مال کے ذریعہ زکوۃ ادا کرنی ضروری ہے یا اس کی قیمت ادا کر دینی بھی کافی ہے؟ اس سلسلے میں ائمہ ثلاثہ کے نزدیک خاص اسی شئے سے زکوۃ ادا کرنی ضروری ہے،(۵) احناف کے نزدیک، صدقۃ الفطر، عشر، نذر اور کفارات میں قیمت ادا کرنی بھی کافی ہے،(۶) ——— دوسرے فقہا کے پیش نظر یہ بات ہے کہ حضور ﷺ نے زکوۃ میں اس مال کا ایک حصہ مثلاً جانوروں میں جانور اور سونا میں سونا وغیرہ، بطور زکوۃ مقرر فرمائی ہے، حنفیہ کے پیش نظر بنیادی طور پر یہ بات ہے کہ زکوۃ کا مقصود فقرا کی ضروریات کی تکمیل ہے اور یہ بہ مقابلہ اصل مال زکوۃ کے، قیمت کے ذریعہ زیادہ صحیح طور پر اور آسانی کے ساتھ حاصل ہو سکتی ہے، اور واقعہ ہے کہ یہ ایک نہایت قوی اور منصفانہ بات ہے اس کو "قربانی " کے مسئلہ پر قیاس نہ کرنا چاہیے کہ قربانی کا مقصد تذکار ابراہیمی کی تجدید ہے اور زکوۃ کا مقصود غربا کی مدد اور ان کی ضروریات کی تکمیل، علاوہ اس کے اس سلسلے میں مصنف ابن ابی شیبہ کی ایک روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے بیت المال کے مویشی میں ایک عمدہ اونٹنی دیکھی

---

(۱) حوالہ سابق (۲) طحاوی علی المراقی ص ۴۷۰
(۳) ہندیہ ۱؍۱۷۱ (۴) رد المحتار ۶؍۸۶
(۵) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲؍۸۵۵ (۶) ہدایہ مع الفتح ۲؍۱۴۳

تو برہمی ظاہر فرمائی۔ ناظم بیت المال نے کہا کہ میں نے دو اونٹ دے کر ایک اونٹنی حاصل کی ہے، اس پر آپ ﷺ نے اطمینان کا اظہار کیا۔ نیز حضرت معاذؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے اہل یمن سے عشر میں رائی اور جو کی بجائے کپڑے دینے کی خواہش فرمائی اور فرمایا کہ اس میں تمہارے لیے آسانی بھی ہے اور صحابہ رسول ﷺ کے لیے زیادہ مناسب بھی۔(۱)

کس وقت کی قیمت معتبر ہوگی؟

چوپایوں اور مویشیوں کی زکوۃ میں زکوۃ ادا کرتے وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ سونا چاندی میں کس وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا؟ اس وقت کا جب زکوۃ واجب ہوئی ہے یا اس وقت کا جب زکوۃ ادا کر رہا ہے؟ اس میں خود فقہا حنفیہ میں اختلاف ہے، امام ابو یوسفؒ و محمدؒ کے نزدیک ادا کرتے وقت کی قیمت معتبر ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہونے کے وقت کی، علامہ شامی نقل کرتے ہیں: وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الاداء وفی السوائم يوم الاداء اجماعاً وهو الاصح .(۲) نیز زکوۃ ادا کرتے ہوئے سامان زکوۃ کی اس نرخ کا اعتبار ہوگا جو اس جگہ ہو جہاں مال زکوۃ ہو، اس جگہ کی قیمت کا اعتبار نہیں جہاں کہ اس مال کا مالک خود رہتا ہو،(۳) ان دونوں مسئلوں میں جو حکم سونا چاندی کا ہے وہی مال تجارت کا بھی ہے۔

زکوۃ میں حیلہ

حیلہ اگر ایسا ہو کہ اس کا مقصود حرام سے اجتناب کرنا ہو تو جائز ہے، ایسا حیلہ جو دوسروں کی حق تلفی کے لیے ہو، جائز نہیں، چنانچہ کوئی شخص زکوۃ سے بچنے کے لیے حیلہ کرے اور سال گذرنے سے پہلے ہی کسی اور کو ہبہ کر دے تاکہ زکوۃ اس پر عائد نہ ہو؟ یہ جائز نہیں، یہی رائے احناف کی بھی ہے،(۴) اور دوسرے فقہا کی بھی(۵) والله عليم بذات الصدور .

بعض لوگوں نے امام ابو یوسفؒ کی طرف یہ نسبت کر دی ہے کہ وہ اس کو جائز کہتے تھے یہ صحیح نہیں ہے، خزانة المفتيين میں ہے:

(۱) فتح القدیر ۱۲۵/۲
(۲) رد المحتار ۲۲/۲
(۳) حوالہ سابق
(۴) الاشباہ والنظائر لابن نجیم : ۴۰۷ الفن الخامس فی الحیل
(۵) المغنی ۲۸۵/۲

الحيلة فی منع الزكوة تكره بالاجماع .(۱)

زکوۃ سے بچنے کا حیلہ بالاجماع مکروہ ہے۔

خود امام ابو یوسفؒ اپنی کتاب الخراج میں لکھتے ہیں:

لايحل لرجل يؤمن بالله واليوم الآخر منع الصدقة ولا اخراجها من ملكه الى ملك جماعة غيره ليفرقها بذالك ، فتبطل الصدقة عنها بان يصير لكل واحد منهم الابل والبقر والغنم مالا يجب فيه الصدقة ولايحتال فی ابطال الصدقة بوجه ولا سبب بلغنا عن ابن مسعود انه قال ما مانع الزكوة بمسلم ومن لم يؤدها فلا صلوة له .(۲)

خدا اور آخرت پر ایمان رکھنے والوں کے لیے جائز نہیں کہ زکوۃ سے بچے اور نہ یہ کہ اپنی ملکیت سے نکال کر کچھ لوگوں کی ملکیت میں دیدے تاکہ ان پر تقسیم ہو جائے تو زکوۃ ان پر واجب نہ رہے اور ان میں سے ہر ایک کے حصہ میں اونٹ گائے اور بکری کی اتنی تعداد آئے کہ زکوۃ واجب نہ ہو پائے اور نہ یہ کہ زکوۃ سے بچنے کے لیے کسی طرح کا حیلہ اختیار کرے، چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ زکوۃ ادا کرنے سے پہلو تہی کرنے والا مسلمان نہیں اور جو زکوۃ ادا نہیں کرے اس کی نماز مقبول نہیں۔

مولانا احمد رضا خان صاحبؒ بریلوی نے اس موضوع پر شرح وبسط کے ساتھ گفتگو فرمائی ہے اور امام ابو یوسفؒ کی طرف اس نسبت کو غلط قرار دیا ہے،(۳) اور اوپر جو خود امام ابو یوسفؒ کی صراحت مذکور ہوئی ہے، وہ اس سلسلے میں دلیل قاطع کا درجہ رکھتی ہے۔

(۱) فتاوی رضویہ ۴۴۳/۴
(۲) کتاب الخراج ص: ۸۰ باب فی الزکوۃ والنقصان والضیاع
(۳) دیکھیے: رسالہ ودوع التعسف عن الامام ابی یوسفؒ فتاوی رضویہ ۴۳۱/۴

باب: ۷

آدابِ زکوٰۃ

آدابِ زکوٰۃ

"زکوٰۃ" گناہوں سے پاکی کا ذریعہ ہے، بخل کا علاج ہے، کشائش رزق کا سامان ہے، اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ صدقات کے ذریعہ مال بڑھتا ہے ویربی الصدقات، (بقرۃ-۲۷۶) اور ارکانِ اسلام میں نماز کے بعد سب سے اہم اور عظیم رکن ہے، لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہے جب اس عبادت کو ان اصول و آداب کے ساتھ انجام دیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں۔ ان احکام وہدایت کی روح یہ ہے کہ خدا کی خوشنودی مطلوب ہو، خدا نے جو کچھ نعمتیں دی ہیں، ان کی شکر گذاری کا جذبہ ہو، بندگانِ خدا پر جو کچھ خرچ کرے، اسے ان کا حق اور اللہ کا احسان جانتا ہو، ریا اور دیکھاوے سے اجتناب ہو اور اہلِ ضرورت کی ایذا و تذلیل سے دامن انفاق پاک و بے داغ ہو، ورنہ اس کے داد و دہش کی مثال ایک بے روح چٹان پر پڑے ہوئے بے برگ وبار گرد و غبار کی ہے جس کو پانی کا ایک کمزور بہاؤ بہا لے جائے اور محنت کش کو کچھ ہاتھ نہ آئے۔

قرآن مجید نے اسی کو اپنے بلیغ اور موثر اسلوب میں یوں کہا ہے:

یا ایھاالذین امنوا لاتبطلوا صدقتکم بالمن والاذی کالذی ینفق مالہ رئاء الناس ولایؤمن باللہ والیوم الاخر فمثلہ کمثل صفوان علیہ تراب فاصابہ وابل فترکہ صلدا لا یقدرون علی شیئی مما کسبوا واللہ لایھدی القوم الکافرین. (بقرہ-۲۶۴)

اے ایمان والو: صدقوں کو احسان رکھ کر اور اذیت پہنچا کر باطل نہ کردو

جس طرح وہ شخص جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کے دکھاوے کو اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا سو اس کی مثال تو ایسی ہے کہ جیسے ایک چکنا پتھر ہے جس پر کچھ مٹی ہے پھر اس پر زور کی بارش ہو سو وہ اس کو بالکل صاف کر دے، ایسے لوگ کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں گے اپنی کمائی سے، اور اللہ کافروں کو راہ ہدایت نہ دکھائے گا۔

من

اس میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ''من'' سے منع فرمایا ہے، ''من'' کے اصلی معنیٰ احسان جتلانے کے ہیں، احسان جتلانا جس صورت میں بھی ہو، سخت مذموم ہے کسی کے ساتھ حسنِ سلوک کا بار بار ذکر کرے، اس کے مقابلہ تکبر اور بڑائی کا اظہار کرے، اس احساس کے ساتھ اس سے خدمت لے کر اس کی مدد کی ہے، یا اس کو اپنی یہ مدد یاد دلائے، یہ سب احسان جتلانے میں داخل ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ ضرورت مند کے ہاتھ میں جانے سے پہلے اللہ کے ہاتھ میں جاتا ہے ، **ان الصدقة تقع بيدالله قبل ان تقع في يدالسائل** .(۱) اس لیے کسی محتاج کو اس کی مدد کے بعد احسان جتلانا در اصل اللہ تعالیٰ پر اپنے احسان کا اظہار ہے اور اس سے بڑھ کر کسی انسان کی محرومی اور بد نصیبی کیا ہو سکتی ہے؟ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ احسان جتلانے والوں کا صدقہ قبول نہیں کرتے۔ **لايقبل الله صدقة منان** . (۲)

اذیٰ

دوسری بات جس کا آیت میں ذکر کیا گیا ''اذیٰ'' ہے۔ اذیٰ کے معنی اذیت پہونچانے اور تکلیف دینے کے ہیں۔ ایذاء بات سے بھی ہو سکتی ہے، اور عمل سے بھی، ڈانٹنا، ڈپٹنا، فقر و افلاس کا طعنہ دینا، بے موقع زکوٰۃ دینے اور مدد کرنے کا اظہار، (۳) فقہاء نے اس کا اتنا خیال رکھا

---

(۱) الاتحاف مع الاحیاء ۴/ ۱۹۳ بحوالہ : دار قطنی و بیہقی فی الشعب

(۲) احیاء العلوم مع الاتحاف ۴/ ۱۹۲

(۱) احیاء العلوم مع الاتحاف ۴/ ۱۹۲

ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے اس بات کو بھی ضروری قرار نہیں دیا ہے کہ اس کے زکوٰۃ ہونے کی صراحت کر کے ہی زکوٰۃ ادا کی جائے بلکہ قرض، ہبہ تحفہ یا عیدی وغیرہ کے نام سے زکوٰۃ دی جائے تب بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، (۱) یہ ساری باتیں اذیت و تکلیف کی ہیں اور انفاق کے اجر کو ضائع کر کے رکھ دیتی ہیں، بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ لوگ کسی ضرورت مند کو اس کی ضرورت پوری کرنے کے سلسلہ میں بار بار بلاتے رہتے ہیں، یہ ٹال مٹول نہایت مذموم طریقہ ہے۔ جس خدا نے زندگی کا ایک ایک سامان مہیا کیا ہے اسی کے نام پر خرچ کرنے میں یہ ٹال اور اس کے رشتہ و حوالہ سے آنے والوں کے ساتھ یہ بدسلوکی حد درجہ احسان فراموشی اور منت ناشناسی ہے۔

یہ اذیت آمیز سلوک جیسے فقراء اور محتاجوں کے ساتھ روا نہیں، اسی طرح محصلین و سفراء کے ساتھ بھی یہ رویہ حد درجہ نامناسب اور خدا ناترسی کی بات ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب صدقہ وصول کرنے والے تمہارے پاس آئیں تو وہ خوش ہو کر جائیں، (۲) ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ زکوٰۃ وصول کرنے والے اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والوں کے درجہ میں ہیں، (۳) حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو صدقہ لیں یا وصول کریں، اپنا محسن سمجھنا چاہیے، شریعت کا مزاج یہ ہے کہ جو شئے کسی عبادت کی تکمیل کا ذریعہ بنے وہ بجائے خود عظمت و اہمیت کی حامل ہوتی ہے اور لائق احترام تصور کی جاتی ہے، مسجدیں نماز و اعتکاف کا ذریعہ ہیں اس لیے ہر مسلمان کے لیے قابل احترام ہیں، حج کا مرکز کعبۃ اللہ ہے، اس لیے واجب التعظیم ہے رمضان کا مہینہ ایک اہم فریضہ روزے کی ادائیگی کا خاص وقت ہے اس لیے تمام مہینوں اور دنوں میں اس کو جو خاص عظمت شان حاصل ہے وہ ظاہر ہے، پس جب زکوٰۃ ان فقراء پر صرف ہوتی ہے، اور مصلحین و عاملین اس کی ادائیگی کا ذریعہ بنتے ہیں تو ضرور ہے کہ ان کا احترام بھی ہر مسلمان کے دل میں رہے۔

ریا و نمائش نہ ہو

زکوٰۃ و صدقات کا تیسرا ادب جس کی طرف خود اس آیت میں اشارہ موجود ہے، یہ ہے

---

(۱) رد المحتار ۲/ ۸۶ (۲) ترمذی عن جریر، باب ما جاء فی رضا المصدق

(۳) حوالۂ سابق ، باب ما جاء فی العامل علی الصدقۃ بالحق

کہ اس میں ریاو نمائش اور اظہار نہ ہو، ممکن حد تک اخفا اور ستر ہو، اس طرح چھپا کر دیا جائے کہ کانوں کان خبر نہ ہو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے بہتر صدقہ یہ ہے کہ کم آمدنی کے باوجود چھپا کر کسی محتاج کو دیا جائے،(۱) ایک روایت میں ہے کہ سات آدمی وہ ہیں جن کو قیامت کے دن سایۂ خداوندی حاصل ہوگا۔ ان میں ایک وہ شخص ہے جو دائیں ہاتھ سے خرچ کرے اور بائیں ہاتھ کو بھی اس کی خبر نہ ہو،(۲) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اس کو سب سے بہتر صدقہ قرار دیا(۳) امام غزالیؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ پوشیدہ طریقہ پر صدقہ اللہ تعالیٰ کی آتش غضب کو فرو کرتا ہے۔(۴)

اللہ تعالیٰ نے نیک جذبہ کے ساتھ صدقہ کی بہر حال تحسین فرمائی ہے، چھپا کر دے یا علانیہ، لیکن پہلے چھپا کر صدقہ کرنے کا ذکر کیا ہے جس سے اس کی اہمیت اور فضیلت کا اظہار ہوتا ہے، ارشاد ہے:

الذین ینفقون اموالهم باللیل والنهار سرًا وعلانیة فلهم اجرهم عند ربهم. (بقرہ-۲۷۴)

جو لوگ دن اور رات میں چھپا کر اور علانیہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔

ایک موقع پر اظہار کے ساتھ بھی صدقہ کی تعریف کی گئی، مگر اخفا و پوشیدگی کے ساتھ صدقہ وخیرات کو زیادہ باعث ثواب فرمایا گیا:

ان تبدوا الصدقات فنعما هی وان تخفوها وتؤتوها الفقراء فهو خیر لکم (بقرہ-۲۷۱)

صدقات علانیہ دو تو بھی ٹھیک ہے، اور اگر چپکے سے فقراء کو دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔

چھپا کر صدقہ دینے میں ریاء و نمائش کے جذبہ کی آپ سے آپ نفی ہو جاتی ہے اور ریاء کا کوئی شائبہ نہیں رہتا، جن لوگوں کو زکوٰۃ دی گئی ہے ان کی آبروریزی نہیں ہوتی، غیرت مند لوگوں کی عزت نفس کو ٹھیس نہیں لگتی اور خود زکوٰۃ لینے والوں کے اخلاق پر بھی اس کا منفی اثر

(۱) الاتحاف مع الاحیاء بحوالہ مسند احمد ۱۷۸/۴ (۲) بخاری باب صدقۃ السر
(۳) مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل اخفاء الصدقۃ (۴) احیاء علوم الدین مع الاتحاف ۱۸۴/۴

نہیں پڑتا، زکوٰۃ لینا، دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور اپنی ضرورت آپ پوری کرنے کے بجائے دوسروں کا دست نگر بن کر رہنا بہر حال ایک ناخوش گوار بات ہے، جو لوگ کھلے عام زکوٰۃ لینے کے عادی ہو جائیں، ان میں رفتہ رفتہ وہ غیرت وحیا بھی ختم ہوتی جاتی ہے جس کا باقی رہنا ضروری ہے اور جس سے محروم ہو جانا بڑے خسارے کی بات ہے، پس زکوٰۃ کا اعلان واظہار جہاں زکوٰۃ دینے والوں کے لیے دینی اور اخروی نقصان کا پیش خیمہ ہے وہیں زکوٰۃ لینے والوں کے لیے اخلاقی پستی اور گراوٹ کا سامان بھی ہے۔

اظہار کے مواقع

ہاں، اگر کہیں علانیہ زکوٰۃ دینے میں کوئی فائدہ ہو اور نقصان نہ ہو، تو ایسے مواقع پر اظہار واعلان کے ساتھ زکوٰۃ دینی افضل ہے، مثلاً امید ہو کہ اس میں دوسروں کو ترغیب ہوگی اور محتاج کی زیادہ مدد ہو جائے گی۔ خود حضور ﷺ سے بعض واقعات مروی ہیں کہ آپ ﷺ نے علانیہ بعض مفلوک الحال وارد ین کی اعانت کرائی ہے، اسی طرح اگر ضرورت مند خود بر سر عام سوال کا ہاتھ بڑھادے تو زکوٰۃ دینے میں حرج نہیں کہ حیاو غیرت کی چادر اس نے خود چاک کر دی ہے،(۱) اور یہاں صدقہ سے انکار میں سائل کی ہتک ہے نہ کہ اس کو دینے میں۔

قرآن مجید میں جہاں اخفاء کے ساتھ زکوٰۃ کے اظہار کو بھی سراہا گیا ہے، وہاں اظہار کے یہی مواقع مراد ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ کی رائے خیال ہے کہ اخفاء کے ساتھ زکوٰۃ دینے کا تعلق فقراء و مستحقین سے ہے اور اظہار کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کا تعلق "بیت المال" کے حوالہ کرنے سے ہے،(۲) چنانچہ حضور ﷺ جہاد یا کسی اجتماعی مقصد کے لیے لوگوں سے تعاون کی ہدایت فرماتے۔ تو علانیہ اپنی امانتیں لانے اور جمع کرنے کو فرماتے، عاملین زکوٰۃ جو آپ ﷺ کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے پر مامور تھے۔ علانیہ زکوٰۃ وصول کرتے، اسلام نے زکوٰۃ کا جو اجتماعی نظام قائم کیا ہے اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ دریوزہ گری اور عزت نفس سے محرومی کے بغیر حاجت مندوں کی تکمیل حاجت کا سامان فراہم کرتا ہے۔

(۱) احیاء العلوم مع الاتحاف ۱۸۸/۴ (۲) سیرت النبی ۲۰۳/۵

بہتر مال کا انتخاب

جو ظاہری مذہبیت کے ساتھ مذہب کی حقیقی روح اور خدا کی خشیت سے محروم ہوتے ہیں ان کا پرانا مرض ہے کہ وہ معمولی اور کم تر اشیاء دیویوں، دیوتاؤں اور اپنے عقیدہ کے مطابق خداؤں کو نذر کرتے ہیں، ایسی چیزیں جن کو خود اپنے لیے پسند نہ کریں، قرآن نے اس پرانی بیماری کی طرف توجہ کی اور انسانی نفسیات کو نشتر لگایا۔

یا ایها الذین امنوا انفقوا من طیبات ماکسبتم ومما اخرجنالکم من الارض ولاتیمموا الخبیث منه تنفقون ولستم باخذیه الا ان تغمضوا فیه . (بقرہ ۲۶۷)

اے مومنو! اپنی کمائی اور ہماری عطا کی ہوئی زمین کی پیداوار کا بہتر حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اس میں معمولی حصّوں کو خدا کی راہ میں دینے کا ارادہ نہ کرو، حالانکہ تم خود اسے قبول نہ کرو، سوائے اس کے کہ چشم پوشی سے کام لو۔

زکوۃ وصدقات کے بارے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ یہ انسان کے لئے ذخیرۂ آخرت اور توشۂ سفر ہے، اللہ کے بندوں کی حاجت پوری کر کے انسان خدا کے خزانہ میں اپنا اجر محفوظ کر لیتا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ اس کے مال واسباب کا بہترین حصہ خدا کے راستے میں خرچ ہو، یہی جذبہ خدا کو محبوب اور اس کے دربار میں مقبول ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون . (آل عمران ۹۲)

جب تک اپنی محبوب چیز خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو، نیکی حاصل نہیں کر سکتے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے صحابہ کی ایسی تربیت فرمائی تھی اور یقین ان کے دلوں میں بٹھادیا تھا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہر ایک نے غور کرنا شروع کیا کہ وہ اپنی جائداد اور مال و اسباب کا سب سے بہتر حصہ خدا کی راہ میں خرچ کرے، اس سلسلے میں حضرت ابو طلحہؓ کا واقعہ حدیث کی اکثر کتابوں میں نقل کیا گیا ہے کہ ان کا ایک نہایت شاندار باغ تھا، انھوں نے یہ ارشاد باری سنتے ہی اس کو راہ خدا میں دینے کی پیش کش کی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ہی اعزہ و اقرباء میں تقسیم کر دیں۔(۱)

(۱) ترمذی، کتاب التفسیر ۱۲۹/۲

افسوس کہ یہ مزاج خدا ناترسانہ آج ہم مسلمانوں میں بھی موجود ہے اور ہمارے سماج میں بھی پرانے استعمال شدہ کپڑے، بچے ہوئے کھانے، گرے پڑے پھل، گھن لگے ہوئے اناج اور بے کار و ناقابل استعمال اشیاء ہی فقیروں، محتاجوں یتیموں اور بیواؤں کے حصہ میں جاتے ہیں، یہ اخلاقی گراوٹ اور یہود جیسی خساست کا مظہر ہے، رمضان المبارک کے موقع پر بعض شہروں میں زکوۃ کے کپڑے تقسیم کرنے کا جو رواج ہوتا جارہا ہے، ان کپڑوں کا معیار اتنا گھٹیا اور معمولی ہوتا ہے کہ خود گداگر بھی ان کے استعمال سے شرمائیں اور اس تقسیم میں جو تشہیر ہوتی ہے وہ عمل کا "نقد اجر" حاصل کرنے اور اجر آخرت سے محرومی کو گوارا کرنے کے مترادف ہے بجائے، اس کے کہ ایک جم غفیر کو کپڑے فراہم کیے جائیں چند افراد کی ضرورت پوری کر دی جائے اور ان کو سوسائٹی میں عام طور پر استعمال ہونے والے کپڑوں کی سطح کے کپڑے دیے جائیں، تو یہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہوگا۔

حلال وطیب مال

خدا کی راہ میں خرچ کیے جانے والے مال جہاں مادی اعتبار سے بہتر ہوں، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ روحانی اعتبار سے پاک و حلال ہوں جو مال حرام بنیاد پر حاصل کیا گیا ہو، شریعت کی نگاہ میں ناپاک ہو، اس کو ثواب واجر کے لیے خدا کے حضور پیش کرنا گویا حکم خداوندی کا مذاق اڑانا اور شریعت سے کھلواڑ کرنا ہے، اسی لیے ایسا انفاق خدا کے ہاں نامقبول ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسے مال میں صدقہ روا نہیں لا صدقة فی غلول .(۱) یہ مال تمام تر اس لائق ہے کہ مالکوں تک پہنچانا ممکن ہو، تو ان کو پہنچایا جائے اور یہ ممکن نہ ہو تو خدا کے محتاج بندوں پر خرچ کر دیا جائے کہ شاید اس طرح اس کے دوش گناہ سبک بار ہو سکیں، زکوۃ کا مقصد انسان کا تزکیہ اور گناہوں سے اس کی پاکی اور تطہیر ہے، (توبہ-۱۳) اور یہ پاک و حلال کمائی ہی کے صرف کرنے سے ہو سکتی ہے نہ کہ حرام اور ناجائز طریقہ پر حاصل کیے ہوئے مال سے۔

البتہ اگر مال حرام حلال مال کے ساتھ اس طرح مل گیا اور مخلوط ہو گیا کہ امتیاز، شناخت باقی نہ رہے تو دونوں مال کے مجموعہ پر زکوۃ واجب ہوگی، فقہاء لکھتے ہیں:

ولو خلط السلطان المال المغصوب بملکه ملکه فتجب

(۱) ترمذی کتاب الطہارۃ ۱/ ۳ عن ابن عمر، باب ماجاء لا تقبل صلوة بغیر طہور

الزکوۃ فیہ ویورث عنہ لان الخلط استھلاک ، اذالم یمکن تمییزہ عند ابی حنیفۃ .(١)

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر سلطان غصب کیے ہوئے مال کو اپنی ملکیت کے ساتھ مخلوط کر دے تو سلطان اس کا مالک ہو جائے گا اس میں زکوۃ واجب ہوگی اور وراثت جاری ہوگی، اس لیے کہ مخلوط کر دینا مال کو ہلاک کر دینا ہے، بہ شرطیکہ اس کی علاحدگی ممکن نہ ہو۔

بہتر مصرف کا انتخاب

زکوۃ ادا کرتے ہوئے جن باتوں کا خصوصیت سے لحاظ کرنا چاہیے، ان میں ایک زکوۃ کے لیے بہتر سے بہتر مصرف کا انتخاب ہے۔ یوں تو جن آٹھ مصارف کا ذکر قرآن میں آیا ہے (توبہ-٦٠) ان میں سے کسی ایک مد میں بھی زکوۃ ادا کر دینی کافی ہے، لیکن زکوۃ لینے والا جتنا زیادہ استحقاق رکھتا ہوگا، اتنا ہی زیادہ زکوۃ دینے والے کو اجر ہوگا، امام غزالیؒ نے بڑی خوبی سے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کو زکوۃ وصدقات میں اولیت دینی چاہیے۔

١ - جن کو زکوۃ صدقات دیے جائیں وہ نیک وپارسا اور متقی لوگ ہوں، اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اہلِ تقویٰ ہی کا کھاؤ اور اہلِ تقویٰ ہی کو کھلاؤ۔ ایسے لوگ اعانتوں سے اپنی عبادت اور تقویٰ کی راہ پر چلنے میں مدد حاصل کریں گے اور ان کی ان نیکیوں میں وہ لوگ بھی شریک سمجھے جائیں گے جو ان کے لیے معاشی قرار واطمینان کا باعث بنے ہوں۔

٢ - علماء، جو علم دین کے حصول میں مشغول ومصروف ہوں، حصولِ علم افضل عبادت ہے، ان کی مدد اس عبادت میں اعانت ہوگی، چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مبارک کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنی اعانتیں علماء ہی پر خرچ کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ مقامِ نبوت کے بعد علما سے بڑھ کر کوئی بلند مرتبہ نہیں۔

٣ - جو غیور اور خوددار ہوں، ہر کسی کے سامنے اپنی احتیاج اور ضرورت کو بیان نہ کرتے ہوں اور نہ دستِ سوال دراز کرتے ہوں، ان کی حاجت مندی ان کی زبان سے ظاہر نہ

(١) ردالمحتار ٢/٢٨

ہوتی ہو بلکہ ان کے چہرے ان کے فقر وکس مپرسی کے گواہ ہوں، قرآن مجید نے ان لوگوں کے بارے میں کہا ہے:

یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف تعرفھم بسیماھم لایسألون الناس الحافا . (بقرہ-٢٧٣)

ناواقف انھیں مالدار خیال کرتا ہے، ان کی احتیاط سوال کے باعث، تو انھیں ان کے بشرہ ہی سے پہچان لے گا وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر نہیں مانگتے۔

٤ - دینی مشغولیت یا دینوی مجبوری نے ان کو معاشی اعتبار سے گرانبار کر دیا ہو یا وہ کسب معاش نہ کر پاتے ہوں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لایستطیعون ضربا فی الارض . (بقرہ-٢٧٣)

اصل حق ان حاجت مندوں کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہوں، وہ ملک میں کہیں چل پھر نہیں سکتے۔

علماء نے اس آیت کا مصداق "اہل صفہ" کو قرار دیا ہے جن کی تعداد چار سو کے قریب تھی اور وہ شبانہ روز تعلیم وتعلم میں مصروف رہا کرتے تھے۔(١)

٥ - اقرباء اور رشتہ دار ہوں کہ ان پر خرچ کرنا دوہرے اجر کا باعث ہے، صدقہ کا اجر بھی ہوگا اور رشتہ وقرابت (صلہ رحمی) کی رعایت بھی ہوگی۔(٢)

ان آداب کا حاصل

ان تمام آداب کا خلاصہ زیادہ سے زیادہ حقدار تک پہنچانے کی سعی، نمائش سے اجتناب، احسان وایذا سے گریز، اخلاص اور سب سے بڑھ کر فروتنی وعاجزی، خدا کی رضاجوئی اور اس کے حضور اپنی اور اپنے اعمال وانفاق کی کہتری کا احساس ہے، امام غزالیؒ نے کسی صاحبِ دل کا بڑا معرفت آمیز مقولہ نقل کیا ہے کہ:

ان الطاعۃ کلما استغرت عظمت عنداللہ عزوجل والمعصیۃ

(١) الاتحاف ٤/٢١٧ (٢) ملخص: احیاء العلوم مع الاتحاف ٤/١٦-٢٠٩ الوظیفۃ الثامنۃ

کلما استعظمت صغرت عنداللہ . (۱)

اطاعت یعنی بندہ کا عمل خود اس کی نگاہ میں معمولی ہوتا ہے تو اللہ کے دربار میں عظمت کا حامل ہوتا ہے اور معصیت جب خود اس کی نظر میں بڑی محسوس ہوتی ہے، تو اللہ کی نگاہ میں معمولی قرار پاتی ہے۔

۞۞۞۞۞۞۞

---

(۱) احیاء العلوم مع الاتحاف ۲۰۱/۴

اسلام کا نظامِ عشر و زکوٰۃ

باب: ۸

صدقۃ الفطر

صدقۃ الفطر

اسلام میں دو دن تیوہار کے ہیں۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ ۔ عید الفطر رمضان کے روزوں پر مسرت کا اظہار ہے اور عید الاضحیٰ حضرت ابراہیم واسماعیلؑ کی قربانی وفداکاری کی یاد گار، خوشی کے ان موقعوں پر اہلِ ایمان رقص وسرور کی بزمیں آراستہ نہیں کرتے بلکہ اپنی جبینِ نیاز بارگاہِ ربانی میں خم کرتے ہیں۔ زبان خدا کی تکبیر میں زمزمہ سنج ہوتی ہے اور ایک ایک حرکت وعمل سے انابت الی اللہ کا اظہار ہوتا ہے ـــــ لیکن ایک مسلمان کی خوشی اس وقت تک ناتمام رہتی ہے جب تک کہ اس کے پڑوس میں بھی خوشی کا چراغ نہ جلے۔ اسی لیے اسلام نے عید الفطر میں "صدقۃ الفطر" اور عید الاضحیٰ میں "قربانی" کا حکم رکھا کہ جہاں نماز دوگانہ کے ذریعہ خدا کا شکر ادا کیا جائے وہیں غریبوں کی مالی اعانت کر کے ان کو بھی مسرت میں شریک کیا جائے۔ وہ خوشی ادھوری ہے جس میں پورا سماج شریک نہ ہو اور جس کی چھاؤں میں غم وفکر کے اندھیرے بھی موجود ہوں۔ عقیقہ ہو یا ولیمہ، سب کی روح یہی ہے۔ اپنی مسرت میں اپنے غریب بھائیوں کی شرکت اور خوشی کے لمحات میں سماج کے پسماندہ لوگوں کو نظر انداز نہیں کرنا۔

صدقۃ الفطر کے لیے حدیث اور فقہ کی کتابوں میں مختلف تعبیرات ملتی ہیں۔ صدقۃ الفطر، زکوۃ الفطر، زکوۃ رمضان، زکوۃ الصوم، صدقۃ الصوم، صدقہ رمضان، صدقۃ الرؤس اور زکوۃ الابدان۔(۱)

---

(۱) عمدۃ القاری ۹/۱۰۷

صدقۃ الفطر کا وجوب

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے مدینہ کے گلی کوچوں میں اپنے منادی کے ذریعہ اعلان کرایا کہ صدقۃ الفطر ہر مسلمان پر واجب ہے۔ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، بالغ ہو یا نابالغ،(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی روایت منقول ہے،(۲) حضرت ثعلبہؓ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے خطبہ عید الاضحیٰ میں اس کی ہدایت فرمائی،(۳) بلکہ سعید بن مسیبؒ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کہا کرتے تھے کہ آیت قرآنی "قد افلح من تزکی" (اعلی-۱۴) میں "تزکی" سے یہی صدقۃ الفطر مراد ہے۔(۴)

چنانچہ عام فقہاء نے صدقۃ الفطر کو زکوۃ ہی کی طرح فرض قرار دیا ہے، بلکہ ابن قدامہ نے تو اس پر اجماع نقل کیا ہے،(۵) البتہ چونکہ اس کی فرضیت قرآن یا متواتر حدیث سے ثابت نہیں اس لیے احناف اس کو واجب قرار دیتے ہیں نہ کہ فرض،(۶) غرض صدقۃ الفطر کے ضروری ہونے پر تمام ہی فقہاء و محدثین کا اتفاق ہے۔

ادائیگی کا وقت

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ عید کے دن نماز کو جانے سے پہلے صدقۃ الفطر نکالنے کا حکم فرماتے تھے،(۷) اس بات کے مستحب ہونے پر سبھوں کا اتفاق ہے، لیکن صدقۃ الفطر کتنا پہلے نکالا جاسکتا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک دو سال پہلے ادا کردے تو بھی جائز ہے،(۸) حنابلہ کے یہاں ایک دو روز پہلے اور شوافع کے یہاں رمضان المبارک شروع ہونے کے بعد ادا کیا جاسکتا ہے۔(۹)

اگر عید کا دن گذر گیا اور صدقہ ادا نہیں کیا تو صدقہ معاف نہیں ہوا، زندگی میں کبھی بھی ادا کرلے،(۱۰) البتہ جہاں تک ممکن ہو عجلت کرے۔

---

(۱) ترمذی، کتاب الزکوۃ، باب ماجاء فی صدقۃ الفطر (۲) حوالہ سابق
(۳) بدائع الصنائع ۲/۶۹ (۴) المغنی ۲/۳۵۱
(۵) حوالہ سابق (۶) بدائع الصنائع ۲/۶۹
(۷) ترمذی، کتاب الزکوۃ باب ماجاء فی تقدیم قبل الصلوۃ (۸) عمدۃ القاری ۹/۱۰۸
(۹) المغنی ۲/۳۵۸ (۱۰) بدائع الصنائع ۲/۶۹

کن لوگوں پر واجب ہے؟

صدقۃ الفطر واجب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شخص مسلمان ہو، بالغ اور صحیح العقل ہونا ضروری نہیں۔ نابالغ یا فاتر العقل ہو لیکن صاحب ثروت ہو تو اس کا ولی اس کے پیسوں سے اس کا صدقہ ادا کرے گا،(۱) ہاں غنی اور مالدار ہو، مالدار ہونے کا معیار کیا ہوگا؟ اس میں فقہا کی رائیں مختلف ہیں۔ اکثر فقہا کا خیال ہے کہ جس کے پاس ایک دن و رات کی خوراک کے علاوہ اتنی مقدار موجود ہو کہ صدقۃ الفطر ادا کرسکے، اسے صدقہ ادا کرنا ہوگا(۲) حنفیہ کی رائے ہے کہ جس کے پاس بنیادی ضروریات (حوائج اصلیہ) رہائشی مکان، سامانِ خورد و نوش، استعمالی کپڑے کے علاوہ کرایہ کے مکانات، زمین، رکھے ہوئے کپڑے، فاضل اجناس، سونا، چاندی یا رقم اتنی مقدار میں ہو کہ ان کی قیمت (ساڑھے ۵۲ تولہ چاندی) کو پہنچ جائے ان پر صدقۃ الفطر واجب ہوگا،(۳) البتہ اگر بروقت صدقہ ادا نہیں کیا اور بعد کو محتاج ہوگیا تو صدقہ معاف نہیں ہوگا بلکہ اس کے ذمہ باقی رہے گا۔(۴)

کن لوگوں کا واجب ہے؟

صدقہ فطر ان تمام لوگوں کی طرف سے نکالنا ضروری ہے جو آدمی کے زیر پرورش ہو اور اس پر اس کو پوری "ولایت" حاصل ہو۔ اس میں نابالغ محتاج لڑکے لڑکیاں دونوں داخل ہیں۔ صحیح العقل بالغ لڑکے، گو محتاج و اپاہج ہوں، بے روزگار ہوں، باپ پر ان کا صدقہ نکالنا ضروری نہیں۔ یتیم پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کا صدقہ بھی دادا، نانا کے ذمہ نہیں ہے،(۵) مگر بعض فقہا نے باپ نہ ہو تو صدقۂ فطر ادا کرنے کا ذمہ دار گب جو گردانا ہے اس لیے احتیاط ان کی طرف سے بھی صدقہ ادا کرنے میں ہے۔ مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے ہاں شوہر کو بیوی کا صدقہ نکالنا چاہیے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بیویاں اپنا صدقہ خود نکالیں گی۔ اس لیے کہ یہ بھی ایک طرح کی زکوۃ ہے اور عورتوں کو خود اپنی زکوۃ ادا کرنی ہوتی ہے،(۶) مگر میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے موجودہ معاشرہ میں معاشی اعتبار سے زوجین جس طرح ایک

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۶۹ (۲) المغنی ۲/۳۵۹
(۳) عالمگیری ۱/۱۹۱ مع الخانیہ (۴) بدائع الصنائع ۲/۶۹
(۵) حوالہ سابق ۲/۷۲-۷۰ (۶) المغنی ۲/۵۹-۶۰

دوسرے کی املاک میں تصرف کرتے ہیں اس کے تحت عام طور پر دونوں کی جائداد میں کوئی تشخص اور امتیاز نہیں رہتا اس لیے ان حالات میں شوہروں کو بیویوں کی طرف سے بھی صدقۃ الفطر ادا کر دینا چاہیے۔

واجب ہونے کا وقت

صدقۃ الفطر واجب ہونے کے وقت میں بھی اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عیدالفطر کی صبح صادق کے وقت جو موجود ہے اس کا صدقہ واجب ہوگا۔ رات میں بچہ پیدا ہو تو صدقہ ادا کرے گا۔ رات میں انتقال ہو گیا تو اس کا صدقہ ادا نہیں کرے گا۔ امام شافعیؒ نے اس کے لیے رمضان المبارک کی آخری تاریخ کے غروب آفتاب کے وقت کو معیار بنایا ہے، جو بچے اس وقت موجود رہے ہوں، ان کا صدقہ واجب ہے، اگر شب میں کسی کا انتقال ہو جائے تو ان کا صدقہ نکالا جائے اور جو بچے رات میں پیدا ہوں، اس عید میں ان کا صدقۃ الفطر نہیں۔(۱)

صدقۃ الفطر کی مقدار

کھجور، کشمش، جو یا گیہوں کے علاوہ کسی اور خوردنی شئ کے ذریعہ صدقۃ الفطر نکالا جائے تو ایک "صاع" نکالنا ہوگا۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ جب حضور ﷺ تھے تو ہم ایک صاع کھانے کے ذریعہ صدقۃ الفطر نکالا کرتے تھے،(۲) اس حدیث میں جو عموم ہے اس کے تحت مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کا خیال ہے کہ گیہوں سے بھی ایک صاع صدقۃ الفطر ادا کیا جائے گا۔ حنفیہ کی رائے ہے کہ گیہوں نصف صاع اور دوسری اشیاء ایک صاع نکالی جائیں گی،(۳) اس لیے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت میں "دو مد" گیہوں کو صدقہ قرار دیا گیا ہے،(۴) اور دو مد کا آدھا صاع ہوتا ہے۔ امام طحاوی نے بھی اسی مضمون کی حدیث ثعلبہ سے نقل کی اور مختلف صحابہ اور تابعین کے آثار بھی اسی کے مطابق نقل کیے ہیں،(۵) البتہ کھجور، کشمش اور جو یا پنیر (جن کا حدیث میں ذکر ملتا ہے) کے علاوہ جن اشیاء کے ذریعہ صدقہ نکالنا ہو، ان میں نصف

(۱) ملخصا: بدائع الصنائع ۲ر۷۲
(۲) ترمذی، کتاب الزکوۃ، باب ما جاء فی صدقۃ الفطر
(۳) بدائع الصنائع ۲ر۷۲
(۴) حوالہ سابق
(۵) شرح معانی الآثار، باب مقدار صدقۃ الفطر

صاع گیہوں کی قیمت کا لحاظ رکھا جائے اور وہی قیمت یا اسی قیمت کا سامان صدقہ کیا جائے۔(۱)
گیہوں کے آٹا اور ستو میں بھی صدقہ کی مقدار نصف صاع ہے۔(۲)

موجودہ اوزان میں

"صاع" کی فقہاء نے دو قسمیں ذکر کی ہیں، عراقی اور حجازی۔ صاع عراقی ۸ ر رطل اور حجازی ۱ر۳-۵ ر رطل کا ہوتا ہے۔ احناف کے ہاں صاع عراقی اور مالکیہ کے ہاں "صاع حجازی" کا اعتبار ہے(۳) گرچہ یہ اختلاف بہت سی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے، مگر در حقیقت کوئی اختلاف نہیں، اصل میں عراقی اور حجازی میں خود "رطل" کی مقدار میں فرق ہے، حجاز میں رطل ۳۰ استار کا اور عراق میں ۱۲۰ استار کا ہوتا ہے۔ علامہ شامی کا بیان ہے کہ اس لحاظ سے ان دونوں پیمانوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا،(۴) پس صحیح یہی ہے کہ یہ محض تعبیر والفاظ کا فرق ہے، کوئی حقیقی فرق نہیں۔

علامہ شامی نے درہم، مثقال، استار، اور مد کے ذریعہ صاع کی جو مقدار ہونی چاہیے، اس کی تعیین فرمائی ہے،(۵) درہم کے اعتبار سے ایک صاع کی مقدار ایک ہزار چالیس درہم ہوتی ہے(۶) درہم کی مقدار متعین کرنے میں علماء ہند کے درمیان جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اس کا ذکر اس سے پہلے چاندی اور سونے کے نصاب میں کیا جا چکا ہے۔ مولانا فرنگی محلی وغیرہ جن لوگوں نے چار جو کو ایک رتی مانا ہے۔ ان کے نزدیک صدقۃ الفطر کی مقدار یعنی آدھا صاع ۹۴ تولہ ۹ ماشہ اور ۲ رتی قرار پاتا ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے مثقال اور درہم کے لحاظ سے صاع کی تعیین کی ہے۔ مثقال کے اعتبار سے نصف صاع ایک سو پینتیس تولہ اور درہم کے لحاظ سے ایک سو چھتیس تولہ چھ ماشہ ہوتا ہے،(۷) اس طرح درہم کے لحاظ سے صدقۃ الفطر کے لیے گیہوں کی مقدار اسی تولہ کے سیر سے ڈیڑھ سیر تین چھٹانک ڈیڑھ تولہ ہوتی ہے،(۸) لیکن جیسا کہ نصاب زکوۃ کے سلسلہ

(۱) عالم گیری ۱ر۱۹۱
(۲) در مختار علی ہامش الرد ۲ر۷۶
(۳) رحمۃ الامہ ص ۱۱۰
(۴) رد المحتار ۲ر۷۶
(۵) رد المحتار ۲ر۷۶
(۶) حوالہ سابق
(۷) جواہر الفقہ ۱ر۴۲۶
(۸) حوالہ سابق ۱ر۴۲۷

میں گذر چکا ہے یہ یا کسی حساب کو اس سلسلہ میں قطعی اور آخری قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ موجودہ دور کے علماء میں مفتی رشید احمد صاحب نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ "بسط الباع" کے نام سے لکھا ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے، مفتی صاحب کی تحقیق کے مطابق صاع کی مقدار مفتی محمد شفیع صاحب کی مقدار سے زیادہ ہوتی ہے یعنی ایک سو بانوے تولہ سے بھی کچھ زیادہ اس طرح نصف صاع کی مقدار جدید اوزان میں اس طرح ہوتی ہے۔

مولانا فرنگی محلی	۹۳ تولہ ۹ ماشہ ۳ رتی	: ۱٫۱۰۶ کلوگرام (۱)
مفتی محمد شفیع صاحبؒ	۱۳۶ تولہ ۶ ماشہ (۲)	: ۱٫۵۹۰ کلوگرام (۳)
مفتی رشید احمد صاحب	۱۹۲ تولہ سے زیادہ	: ۲٫۲۵ کلوگرام (۴)

ہندوستان کے اکثر ارباب افتاء کی رائے مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی رائے سے قریب ہے۔(۵)

کہاں صرف کیا جائے؟

جس کی جانب سے صدقۃ الفطر نکالنا ہو، وہ جہاں اور جس شہر میں ہو وہیں صدقہ دینا بہتر ہے۔ اگر ایک شخص خود دور ہو، اور بال بچے گھر پر رہتے ہوں تو بچوں کا صدقہ وہاں ادا کرے جہاں وہ ہیں اور اپنا صدقہ وہاں کے فقراء پر صرف کرے جہاں وہ خود مقیم ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ سے ایک روایت ایسی بھی منقول ہے کہ وہ قرابت داروں تک صدقہ پہنچانے کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر صدقہ کی منتقلی میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔(۶)

(۱) تحفۃ الصوفیہ ۴۴ (۲) جواہر الفقہ ۱/۴۲۸ رسالہ "اوزان شرعیہ"

(۳) راقم الحروف نے متعدد ماہرین ریاضی و زیور فروش تاجروں سے ربط قائم کیا۔ ان حضرات نے ۱/۵-۸۹٫۷۰۰ گرام بتلایا۔ میں نے کسر کو پورا کر کے ایک کلو پانچ سو گرام لکھا ہے۔

(۴) احسن الفتاویٰ ۴/۳۰۶

(۵) ملاحظہ ہو: فتاویٰ دار العلوم ۶/۳۲۳ (مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی) فتاویٰ رضویہ ۴/۴۹۳ مولانا احمد رضا خاں صاحبؒ) کفایت المفتی ۴/۲۹۲ (مفتی کفایت اللہ صاحبؒ)

(۶) بدائع الصنائع ۲/۷۵

مصارف صدقہ

جن لوگوں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے انھیں کو صدقۃ الفطر بھی دیا جاسکتا ہے،(۱) فرق صرف اتنا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے ہاں غیر مسلم (ذمی) کو بھی صدقۃ الفطر ادا کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے فقہاء کے ہاں نہیں دے سکتے،(۲) صدقۃ الفطر میں بھی تملیک یعنی مالک بنا دینا ضروری ہے، ایسی تمام صورتیں کہ ان میں مالک بنانے کی صورت نہ پائی جاتی ہو صدقہ دینا اسی طرح درست نہ ہوگا جیسے کہ زکوٰۃ،(۳) کم سے کم ایک آدمی کا صدقۃ الفطر ایک آدمی کو دینا چاہیے۔ ایک صدقہ دو محتاجوں پر تقسیم کر دیا جائے، یہ بہتر نہیں ہے۔ ہاں ایک محتاج شخص کو ایک سے زیادہ صدقہ دیا جاسکتا ہے۔(۴)

صدقۃ الفطر کی وصولی اور تقسیم کے لیے بھی بہتر ہے کہ مختلف علاقوں میں اجتماعی نظام قائم کیا جائے۔ ضرورت مندوں کا سروے کر کے ان تک پہنچایا جائے۔ مولانا عبد الصمد رحمانی نے چند روایات نقل کی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اوائل اسلام میں بھی ایسا نظم ہوا کرتا تھا، مؤطا امام محمد میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ دو تین دنوں پہلے وہ صدقۃ الفطر اس شخص کے پاس بھیج دیتے جو اس کو جمع کیا کرتے۔ ابن خزیمہ نے بھی نقل کیا ہے کہ ابن عمرؓ جب عامل بیٹھتا، تو اس کے پاس صدقۃ الفطر جمع کرا دیتے اور یہ عامل عید سے ایک دو دن قبل بیٹھتا،(۵) علامہ شامی نے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو صدقہ جمع کرنے پر مامور فرمایا تھا،(۶) پس معلوم ہوا کہ خود امیر تو اس کے لیے اپنے عامل نہ بھیجے گا لیکن لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنا فطرہ بیت المال میں یا کسی اور نظم کے تحت اجتماعی طور پر جمع کریں۔

چند ضروری مسائل

❁ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ جو لوگ روزہ رکھیں انہیں پر صدقۃ الفطر واجب ہے،

(۱) عالم گیری ۱/۱۹۴ (۲) المغنی ۲/۳۶۵

(۳) بدائع الصنائع ۲/۴۷

(۴) رد المحتار ۲/۷۸ بعض فقہاء نے اس بات کو واجب اور صدقہ ادا کرنے کے لیے شرط قرار دیا ہے کہ ایک محتاج کو کم سے کم ایک مکمل صدقہ دیا جائے۔ (دیکھیے: ہندیہ ۱/۱۹۳) اس لیے اس پر عمل کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۵) ملاحظہ ہو: کتاب العشر والزکوٰۃ ۲۳۰-۲۲۲ (۶) رد المحتار ۲/۷۹

حالانکہ ایسا نہیں ہے، صدقہ مستقل واجب ہے۔ عذر کی وجہ سے یا بلا عذر کوئی شخص روزہ نہ رکھ پائے پھر بھی اس کو صدقہ ادا کرنا ہے۔(۱)

- اگر کسی انسان کا پورا مال ضائع ہو جائے تو زکوۃ واجب نہیں رہتی، مگر صدقہ واجب رہتا ہے۔(۲)
- ماں باپ اور نابالغ بھائیوں کا صدقہ نکالنا ضروری نہیں، گو وہ اس کے زیر پرورش ہوں نکال دے تو اجر ہے۔(۳)
- کوئی شخص صدقہ نہ نکال پایا تو اس کی وصیت کر جانی چاہیے۔ وصیت کر دے تو متروکہ کے ایک تہائی سے وصیت پوری کی جائے گی۔ وصیت نہ کی تو بھی ورثہ کا صدقہ نکال دینا بہتر ہے۔(۴) صدقۃ الفطر گیہوں کے ذریعہ نکالنا زیادہ بہتر ہے، (۵) قیمت کے ذریعہ فطرہ ادا کیا جائے، تو جہاں ادا کر رہا ہے وہاں کی قیمت کا اعتبار ہو گا۔(۶)

❁❁❁❁❁❁❁

---

(۱) در المختار ۲/۳۷ (۲) بدائع الصنائع ۲/۷۵

(۳) ہندیہ ۱/۱۹۳ (۴) حوالہ سابق

(۵) رد المختار ۲/۷۸۔ بعض حضرات نے قیمت ادا کرنے کو افضل بتایا ہے۔ بعض نے عام حالات اور زمانہ قحط میں فرق کیا ہے۔ بعض نے خود گیہوں ادا کرنے کو۔ میں نے اس کو اس لیے ترجیح دیا کہ اس میں حدیث پر بعینہ عمل بھی ہے اور اس میں احتیاط بھی ہے۔ قیمت گیہوں کے لحاظ سے لگائی جائے تو کھجور کے لحاظ سے نامکمل رہ جاتی ہے۔

(۶) در علی ہامش الرد ۲/۲۲

اسلام کا نظام عشر و زکوۃ

باب: ۱۰

صدقات نافلہ

صدقاتِ واجبہ

زکوۃ اور صدقۃ الفطر مسلمانوں پر مستقل واجبات میں ہیں، لیکن اس کے علاوہ بھی مختلف صورتیں ہیں جن میں شریعت نے مسلمانوں پر انفاق کو واجب قرار دیا ہے اور اس کے لیے اسلام نے ایک خاص تدبیر یہ کی کہ عبادات اور حقوق میں ہونے والی مختلف کوتاہیوں کی تلافی کے لیے صدقہ کو ضروری قرار دیا، غلطی کا صدور انسان کی سرشت میں ہے، غلطی اور خطاء کو صدقہ وانفاق کی اساس بناکر از خود ایسی صورت پیدا کر دی گئی کہ بندگانِ خدا بار بار محتاجوں اور ضرورت مندوں کی طرف نگاہِ التفات اٹھائیں اور دست اعانت بڑھائیں !

اس سے انفاق اور خیرات کی عظمت بھی دل میں بیٹھتی ہے کہ یہ اتنی بڑی نیکی ہے کہ اس کے ذریعہ حقوق اللہ کی کوتاہیاں معاف ہوتی ہیں جو ہاتھ غریبوں کی مدد اور محتاجوں کی حاجت برآری کے لے بڑھتا ہے، وہی جب خدا کے سامنے توبہ استغفار کے لیے اٹھتا ہے تو سب سے بڑے حاجت رواکی چوکھٹ سے ممنون کرم اور بامراد واپس آتا ہے۔

یہاں انہی صدقات کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو خاص مواقع پر واجب قرار دیا گیا ہے ان میں ایک ''کفارات'' ہیں ''کفارہ'' اس عمل کو کہتے ہیں جو گناہ کو مٹادے، بعض گناہ وہ ہیں جو توبہ سے معاف ہوتے ہیں، بعض شرعی سزاؤں یعنی حدود کے ذریعہ، البتہ احناف کے ہاں ''حدود'' سے گناہ معاف نہیں ہوتے، حدود کے ساتھ سزا پانے والوں کی توبہ وندامت گناہ کی معافی کا باعث بنتی ہے بعض گناہ ایسے ہیں کہ خود شریعت نے مخصوص اعمال کو ان کے لیے کفارہ بتایا ہے۔ کفارات میں بھی اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ دو طرح کے اعمال مقرر کیے جائیں، ایک وہ جو

جسمانی مشقت کے ہوں، دوسرے وہ جو مالی قربانی چاہتے ہوں تاکہ حاجت مند و غریب اور اہلِ ثروت اور صحتِ جسمانی کے اعتبار سے ناتواں دونوں طبقوں کی رعایت ہو سکے۔

یہ کفارات چار طرح کے ہیں : قتل، ظہار، روزہ، قسم۔

کفارۂ قسم

قسم کے کفارہ کے سلسلے میں ارشاد ہے :

لا یؤاخذ کم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذ کم بما عقدتم الایمان فکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین من اوسط ماتطعمون اهلیکم اوکسوتهم اوتحریر رقبۃ فمن لم یجد فصیام ثلاثہ ایام ذالك كفارة ايمانكم اذا حلفتم واحفظوا ايمانكم . (المائدہ-۸۹)

اللہ تعالیٰ، "یمین لغو" میں تمہاری پکڑ نہیں کریں گے، لیکن تمہاری ان قسموں پر پکڑ کریں گے جن کا تم نے ارادہ کیا ہے، ان کا کفارہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجہ کا کھانا کھلانا ہے جو اپنے لوگوں کو کھلاتے ہو، یا ان کو کپڑے مہیا کرنا، یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ میسر نہ ہو تو تین دنوں روزے رکھنا ہے جب تم قسم کھاؤ تو یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے اور اپنے قسم کی حفاظت کیا کرو۔

مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھالے اور قسم کو پوری نہ کر پائے تو کفارہ واجب ہونے پر اتفاق ہے، ماضی کی کسی بات پر غلط قسم کھالے، تو خواہ یہ غلطی عمداً کی ہو اور جھوٹ بولا ہو یا اس کو صحیح سمجھ کر قسم کھالے، امام شافعیؒ کے ہاں ہر دو صورت میں کفارہ واجب ہوگا، امام ابو حنیفہؒ اور دوسرے فقہاء کے نزدیک ان صورتوں میں کفارہ واجب نہ ہوگا۔(۱)

ان تینوں میں سے ایک عمل بھی کفارہ کے لیے کافی ہے، دس مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ایک صورت یہ ہے کہ ہر ایک کو کھانے کا مالک بنا دیا جائے، یہ صورت بالاتفاق جائز ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ دن اور رات دو وقت کھانا کھلا دیا جائے، احناف کے یہاں یہ

(۱) الجامع الاحکام القرآن ۱۶۵/۶

صورت بھی کافی ہے مگر مالکیہ اور شوافع اس صورت کو کفارہ ادا کرنے کے لیے کافی قرار نہیں دیتے اور پہلی صورت کو ضروری قرار دیتے ہیں، (۱) کھانے کا مالک بنایا جائے تو امام ابو حنیفہؒ کے ہاں فی کس آدھا صاع (۲٫۲۵ کلوگرام) اور مالکیہ اور شوافع کے ہاں ایک مد (۱٫۰۱۳ کلوگرام) فی کس دیا جائے۔(۲)

دوسرا کفارہ دس مسکینوں کو کپڑے فراہم کرنا ہے، امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے کہ یہ ایک مکمل کپڑا ہونا چاہیے جو جسم کے بالائی اور زیریں حصہ کو کفایت کر سکے۔ لکل مسکین ثوب وازار . (۳) حنفیہ کے ہاں کپڑے اور کھانے کی بجائے اس کی قیمت بھی دی جاسکتی ہے، مالکیہ اور شوافع کے ہاں کھانے اور کپڑے ہی دئے جانے ضروری ہیں، فقہاء مالکیہ میں ابن عربی نے بھی حنفیہ کے نقطہ نظر کی تائید کی ہے۔(۴)

قتل کا کفارہ

قتلِ مومن اسلام کی نگاہ میں شرک کے بعد غالباً سب سے بڑا جرم ہے، قرآن مجید نے ازراہِ انذار کہا ہے کہ جان بوجھ کر جو شخص مسلمان کے قتل کا مرتکب ہوا، اس کی سزا دوزخ کی ابدی عقوبت ہے، ہاں ایسا ہو سکتا ہے کہ نشانہ چوک جانے کی وجہ سے یا کسی اور صورت میں قصد و ارادہ کے بغیر خطا ایک مسلمان کے ہاتھ دوسرے مسلمان کی جان چلی جائے، ایسی صورت میں ایک طرف تو مقتول کے ورثا کو وہ خوں بہا (دیت) ادا کرے گا۔ دوسرے اس بے ارادہ غلطی سے عنداللہ معافی کے لیے کفارہ ادا کرے گا اور وہ یہ کہ یا تو کسی غلام کو آزاد کردے اور اگر اس کی قدرت نہ ہو یا سلسلہ غلامی کے انسداد کی وجہ سے اس کا امکان نہ ہو تو مسلسل ساٹھ روزے رکھے۔(نساء-۹۲)

چنانچہ حنفیہ اور مالکیہ کے یہاں تو بہر طور روزہ رکھنا ہی ضروری ہے لیکن حنابلہ کا خیال ہے کہ روزہ نہ رکھ سکتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا بھی کافی ہو جائے گا اور اسی کے مطابق

(۱) الجامع لاحکام القرآن ۲۷۶/۶ (۲) الجامع لاحکام القرآن ۲۷۶/۶

(۳) حوالہ سابق ۲۷۹/۶ ورنہ کم سے کم ایسا ہو کہ جس سے کا تاحصہ ڈھک جائے جس میں نماز درست ہو جائے۔

ہدایہ ربع دوم ۴۸۰۔ (۴) حوالہ سابق ۲۸۰/۶

ایک قول امام شافعیؒ کا بھی ہے۔(۱)

کفارۂ ظہار

"ظہار" بیوی کو محرم یا اس کے کسی عضو حرام سے تشبیہ دینے کا نام ہے، زمانۂ جاہلیت میں اس کو طلاق سمجھا جاتا تھا، اسلام میں پہلی بار یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت اوس بن صامتؓ نے حضرت خولہؓ کے ساتھ ظہار کیا۔ اس موقع سے آیتِ قرآنی نازل ہوئی اور حکم ہوا کہ ظہار سے طلاق تو واقع نہ ہوگی لیکن کفارہ واجب ہوگا اور جب تک کفارہ ادا نہ کر دے بیوی سے جنسی تعلق جائز نہ ہوگا(۲) اس کفارہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا:

> **والذین یظاھرون من نسائھم ثم یعودون لما قالوا فتحریر رقبة من قبل ان یتماسا ذلکم توعظون به والله بماتعملون خبیر ، فمن لم یجد فصیام شھرین متتابعین من قبل ان یتماسا فمن لم یستطع فاطعام ستین مسکینا .** (المجادلہ ۳،۴)
>
> جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں، پھر اپنی بات سے رجوع کریں تو ہم بستری سے پہلے ایک غلام آزاد کر دیں، یہ حکم ہے کہ تم لوگ اس سے عبرت حاصل کرو اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ ہمبستری سے پہلے مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے، اس کی بھی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

اس میں غلام کو آزاد کرنا اور ساٹھ مسکینوں کو کھلانا ان دونوں افعال کا تعلق محتاج انسانوں کی مدد سے ہے۔ البتہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی بابت بعض تفصیلات میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، شوافع کے ہاں مالک بنانا ضروری ہے، احناف کے ہاں دستر خوان پر اس طرح کھلانا کہ وہیں کھالیں، یعنی "اباحت" بھی کافی ہے، شوافع کے ہاں ساٹھ الگ مسکینوں کو کھانا دیا جانا ضروری ہے، حنفیہ کے ہاں ایک ہی مسکین کو ساٹھ دنوں کھانا دیدیا جائے تو یہ بھی کافی ہو جائے، شوافع کھانا دینے ہی کو ضروری قرار دیتے ہیں، حنفیہ اس کی قیمت دیدینے کو بھی

(۱) احکام القرآن للعثمانی ۲/ ۳۲۷ (۲) دیکھیے: الدر المنثور ۸/ ۷۰ احکام القرآن للجصاص ۳/ ۳۱۷

کافی جانتے ہیں۔(۱)

روزہ کا کفارہ

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک صاحب نے رمضان المبارک میں روزہ کے درمیان اپنی بیوی سے صحبت کرلی، پھر پشیماں ہوئے تو بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے ان کو اس کا کفارہ بتایا کہ اول ایک غلام آزاد کیا جائے، یہ ممکن نہ ہو تو ساٹھ روزے رکھے جائیں، یہ بھی ممکن نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے(۲) روزہ میں کفارہ میں بھی ساٹھ مسکینوں کو کھلانے میں وہی تفصیلات اور فقہی اختلافات ہیں جو قسم اور ظہار کے سلسلہ میں ذکر کی گئی ـــــــ شوافع کے ہاں تینوں میں سے کسی کو بھی اختیار کرنے کی آزادی ہے۔ حنفیہ کا خیال ہے کہ جو غلام کی آزادی اور روزوں پر قادر نہ ہو، وہی مسکینوں کو کھانا کھلا کر کفارہ ادا کر سکتا ہے،(۳) شوافع اور حنابلہ کے ہاں یہ کفارہ اسی وقت واجب ہوتا ہے جب کہ روزہ میں جماع کیا گیا ہو، حنفیہ اور مالکیہ کا خیال ہے کہ روزہ خورد و نوش کے ذریعہ توڑ لیا جائے تو اس صورت میں بھی جماع ہی کی طرح کفارہ واجب ہوگا۔(۴)

روزۂ و نماز کا فدیہ

اگر کوئی شخص درازی عمر یا صحت کی کمزوری کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے تو ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے "فدیہ" کا حکم رکھا ہے:

> **فمن کان منکم مریضاً اوعلی سفر فعدة من ایام اخر وعلی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین فمن تطوع خیرا فھو خیرله وان تصوموا خیرلکم ان کنتم تعلمون .** (بقرہ-۱۸۴)
>
> تم میں سے جو بیمار یا مسافر ہو تو بجائے رمضان کے اتنے ہی دنوں دوسرے ایام میں روزہ رکھ لے اور جو لوگ بہ مشقت ہی روزہ رکھ سکتے

(۱) دیکھیے: احکام القرآن للعثمانی ۵/ ۱۹-۱۸
(۲) بخاری، کتاب الصیام، باب اذا جامع فی رمضان ولم یکن له شئ الخ
(۳) ہدایہ، ربع اول ۲۲۰ (۴) رحمۃ الامۃ ۱۳۲

ہوں، وہ فدیہ ادا کر دیں یعنی ایک مسکین کو کھانا کھلائیں جو بطور نفل
اضافہ کرے، اس کے لیے وہ بہتر ہوگا، تاہم روزہ رکھنا ہی تمہارے لیے
زیادہ بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔

اوپر میں نے "یطیقونہ" کا ترجمہ کیا ہے کہ "جو لوگ بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہوں" یہی تشریح اس کی بعض سلف صالحین نے کی ہے،(۱) اور خیال ہوتا ہے کہ بمقابلہ ان توجیہات و تاویلات کے جو دوسرے اہل علم نے کی ہے، یہ زیادہ مناسب ہے۔

ایسا شخص جو کبر سنی کی وجہ سے رمضان کے روزے نہ رکھ سکتا ہو، یا پہلے کے قضا روزے باقی ہوں اور اب کبر سنی یا بیماری کی وجہ سے قضا کرنے کے لائق نہ ہو، روزوں کے فدیہ ادا کرے گا اور اگر موت سے پہلے وصیت کر جائے تو اس کے ورثا فدیہ ادا کریں گے،(۲) احناف کے علاوہ دوسرے فقہاء کے ہاں دو اور صورتوں میں بھی فدیہ واجب ہوتا ہے ایک اس وقت کہ رمضان کے روزے فوت ہوگئے، اور آئندہ رمضان تک بھی قضا نہ کر سکا، ایسی صورت میں فوت شدہ روزوں کی قضا اور فدیہ بھی واجب ہوگا،(۳) دوسرے حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین جو حمل اور دودھ پلانے کے دوران روزہ نہ رکھیں، وہ روزہ کی قضا بھی کریں گی اور ان دنوں کا فدیہ بھی ادا کریں گی، احناف کے ہاں ان دونوں صورتوں میں صرف قضا واجب ہوگی، فدیہ نہ ہوگا،(۴) ——— احناف کے ہاں اگر کچھ نمازیں اس طرح فوت ہو جائیں کہ وہ نماز پڑھنے پر قادر تھا، لیکن نہ پڑھی، تو ان کا فدیہ ادا کرنے کی وصیت کر دینی چاہیے۔ ایسی صورت میں اس کے متروکہ میں سے فدیہ ادا کیا جائے گا،(۵) دوسرے فقہاء کے ہاں نماز فوت ہونے پر فدیہ نہیں ہے۔

فدیہ یہ ہے کہ ہر روزہ یا نماز کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلائے یا آدھا صاع (۲،۲۵ کلوگرام) گیہوں ادا کرے،(۶) دوسرے فقہاء کے ہاں اس کی آدھی مقدار (۱،۱۳ کلو گرام) ادا کی جائے۔(۷)

---

(۱) دیکھیے: روح المعانی — (۲) ہدایہ، ربع اول ۲۲۲
(۳) رحمۃ الامۃ ۱۲۳ — (۴) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۶۸۸/۲
(۵) مراقی الفلاح ۷۴ — (۶) ہدایہ ربع اول ۲۲۲
(۷) رحمۃ الامۃ ۱۲۳

نذر

آدمی اپنے آپ پر کوئی ایسی عبادت لازم کر لے جو پہلے سے اس پر لازم نہیں تھی اس کو "نذر" کہتے ہیں،(۱) اگر آدمی کسی کار طاعت کی نذر مانے تو اس کو پورا کرنا چاہیے، بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ من نذر ان یطیع اللہ فلیطعہ. اور کسی گناہ کی بات کی خدا نخواستہ نذر مان لے تو اس کو ترک کر دینا چاہیے، مسلم میں حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ گناہ سے متعلق نذر پوری نہ کی جائے۔(۲)

پس اگر کسی شخص نے مطلقاً صدقہ کی نذر مانی، یا کسی شرط کے ساتھ نذر مانی کہ فلاں کام ہو گیا تو اتنا صدقہ کروں گا ایسی صورتوں میں نذر کے مطابق صدقہ کرنا، اس پر واجب ہوگا،(۳) اسی طرح اگر کوئی شخص قربانی کی نذر مانے تو قربانی اس پر واجب ہوگی (الحج-۲۹) اور چونکہ یہ قربانی صدقات واجبہ کے قبیل سے ہوگی اس لیے اس میں سے خود کھانا جائز نہ ہوگا۔(۴)

جنایات حج

حج میں کچھ باتوں سے منع کیا گیا ہے، قرآن و حدیث میں تفصیل سے ان کا ذکر آیا ہے اور فقہاء نے حج کے احکام میں "جنایات" کے عنوان سے ان کو ذکر کیا ہے، ان ممنوعات کے ارتکاب پر دو صورتوں میں اونٹ کی اور بہت سی صورتوں میں بکری کی قربانی واجب ہوتی ہے، بعض صورتوں میں صدقہ کرنا ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں شکار کیے ہوئے جانور کی قیمت یا اسی جثہ کے پالتو جانور کی قربانی واجب قرار دی گئی ہے یہ تمام صورتیں صدقہ کی ہیں اور ان کا مصرف فقراء و مساکین ہیں، نہ خود کھا سکتا ہے نہ ان میں سے اہل ثروت کو کھلا سکتا ہے۔(۵)

قربانی

قربانی کا جانور اور اس کے اجزاء اصلاً صدقہ نہیں ہیں، اسی لیے ان کا خود کھانا یا مالدار دوستوں کو کھلانا اور اعزہ و اقرباء میں تقسیم کرنا نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے، لیکن قربانی کے جانور

---

(۱) الجامع لاحکام القرآن ۳۳۲/۳ — (۲) الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ، ربع دوم، ۴۸۳
(۳) ہدایہ ربع دوم ۴۸۳ قبیل باب الیمین فی الدخول والسکنیٰ
(۴) الجامع لاحکام القرآن ۴۵/۱۲ — (۵) دیکھیے: کتب فقہ، بالخصوص ہدایہ باب الجنایات

کا کوئی بھی حصہ، گوشت، سراپایہ، چرم، ہڈی، وغیرہ فروخت کردی جائے تو پھر اس کی قیمت کا صدقہ کردینا واجب ہو جاتا ہے اور فقراؤ مساکین ہی اس کے حقدار ہیں۔(۱)

لقطہ

گری پڑی ہوئی چیز۔ خواہ روپے پیسے ہوں یا بھٹکے ہوئے مویشی۔ مل جائیں اور مطلوبہ تشہیر واعلان کے باوجود مالک کا پتہ نہ چل سکے، تواب اس کا صدقہ کردینا واجب ہے، اگر پانے والا خود مستحق صدقہ ہو تو خود بھی استعمال کر سکتا ہے، اگر صاحبِ ثروت ہو تو اپنی ذات پر استعمال روا نہیں، نہ کسی اور ایسے شخص کو دے سکتا ہے جو غنی ہو، امام شافعیؒ کے یہاں پانے والا غنی و مالدار ہو تب بھی اس کو اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔(۲)

صدقات واجبہ کے مصارف

صدقاتِ واجبہ کی ان معروف صورتوں نیز ان کے علاوہ جو اور صورتیں ممکن ہیں، ان سب میں اصول یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کا جو مصرف ہے، اس مصرف میں ان مدات کی رقوم کو بھی صرف کیا جائے گا، علامہ شامی نے مصارف زکوٰۃ پر بحث کرتے ہوئے شروع ہی میں واضح کردیا ہے کہ :

وهو مصرف ايضا لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذالك من الصدقات الواجبة. (۳)

یہی مصرف صدقۃ الفطر، کفارہ، نذر اور دوسرے صدقات کا بھی ہے۔

زکوٰۃ ہی کی طرح ان صدقات واجبہ کا بھی اولین مقصد اہلِ حاجت کی تکمیل حاجت ہے اہلِ دولت یعنی جو لوگ زکوٰۃ کے مستحق نہ ہوں۔ ان پر ان مدات کی اشیاء اور رقوم کو خرچ کرنا جائز نہیں، صاحب ہدایہ نے لقطہ (گری پڑی چیز جو مل جائے) کے بارے میں لکھا ہے :

ولا يتصدق باللقطة على غنى لان المامور به هو التصدق لقولهٗ فان لم يات يعنى صاحبها فليتصدق به والصدقة لايكون

(۱) ہدایہ ۴/۴۴۴ الشرح الصغیر ۲/۱۴۷ (۲) ہدایہ ۲/۶۱۳ کتاب اللقطہ
(۳) ردالمحتار ۲/۵۸

على غنى فاشبه الصدقة المفروضة. (۱)

لقطہ مالدار پر صدقہ نہیں کیا جائے گا اس لیے کہ ارشاد نبوی ﷺ "اگر مالک نہ آئے تو اسے صدقہ کردے" کے تحت صدقہ کرنے کا حکم ہے اور مالدار پر صدقہ نہیں ہوتا، لہٰذا یہ زکوٰۃ فرض کے مشابہ ہو گیا۔

اضطراری اور ہنگامی حالات میں مدد

"صدقات واجبہ" ہی کے قبیل سے اضطرار میں مبتلا افراد اور سماج کی مدد ہے غالباً اسی طبقہ کو قرآن مجید نے "محروم" سے تعبیر کیا ہے وفى اموالهم حق للسائل والمحروم (ذاریات-۱۹) ایک اور موقع پر بھی قرآن مجید نے اس طبقہ کا ذکر کیا ہے، اور ان کو صاحبِ حق قرار دیا ہے، (معارج-۲۵) گو بعض لوگوں نے اس سے زکوٰۃ کا حق مراد لیا ہے (۲) مگر مصارف زکوٰۃ میں فقیر اور مسکین کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں "محروم" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حق زکوٰۃ کے سوا کوئی اور ہنگامی مدد اور حق مراد ہے، اکثر علماء کی رائے یہی ہے کہ زکوٰۃ کے سوا ایک اضافی مالی حق کا اس آیت میں ذکر آیا ہے، جس میں والدین اور اقرباء کا نفقہ اور مضطر کے لیے کھانے کا نظم وغیرہ داخل ہے (۳) فقہا لکھتے ہیں کہ کوئی شخص اضطرار کی حالت میں مبتلا ہو، نہ کھائے تو جان جانے کا اندیشہ ہو، تو دوسرے کا مال اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر بھی کھا سکتا ہے، (۴) ایسے مواقع پر مشہور حنفی فقیہ و محدث امام طحاوی اور ابن سماعہ وغیرہ نے غصب کی بھی اجازت دی ہے۔(۵)

علامہ ابن حزم نے اس مسئلہ پر بڑے شرح وبسط سے روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں :

ہر شہر کے دولت مندوں کا فریضہ ہے کہ اپنے یہاں کے فقراء کی کفالت کریں۔ اگر زکوٰۃ اور مسلمانوں کے مال سے ہونے والی آمدنی ان کے لیے کافی نہ ہو تو سلطان اہلِ دولت کو اس پر مجبور کرے گا اور ان کے لیے ضروری خوراک، جاڑے، گرمی کے مناسب لباس، بارش، گرمی،

(۱) ہدایہ ۲/۶۱۷ (۲) احکام القرآن للجصاص ۳/۴۱۲
(۳) احکام القرآن (مولانا ادریس کاندھلوی) ۵/۳ (۴) در مختار علی ہامش الرد، ۵/۲۵۶ ط مکتبہ نعمانیہ دیوبند
(۵) الاشباہ والنظائر لابن نجیم ۹۰

دھوپ اور لوگوں کی نگاہوں سے بچاؤ کے لیے موزوں مکانات کا نظم کریگا۔(۱)

پھر اس پر مختلف آیات، احادیث اور آثارِ صحابہ سے استدلال کیا ہے، جس میں اعزہ و محتاجوں اور مساکین کی مدد اور لوگوں کے ساتھ رحمدلی اور کرم گستری کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کا ایک ارشاد اور حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ کا عمل خصوصیت سے قابل ذکر ہے، حضرت عمرؓ نے غالبًا اپنے زمانے کے شدید ترین قحط کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر آئندہ ایسا ہوا تو میں دولتمندوں کے مال کا زیادہ حصہ لے کر فقراء مہاجرین پر اس کو تقسیم کردوں گا [illegible]

[illegible]

لیکن نہ یہ ایسی حکومتوں کے لیے ہے جو ایوان حکومت کی شان و بان اور اس کے مکینوں کی عیش و عشرت اور شاہ خرچیوں میں خزانہ ملکی کا بے جا اور بے دریغ استعمال کریں اور نہ یہ اس اشتراکی نظام کی تائید ہے جو افراد کی املاک کو مستقل طور پر ملک کی اجتماعی ہیئت کے حوالے کردے۔

ٹیکس کی فقہی اور شرعی حیثیت

یہیں سے ٹیکس کی فقہی اور شرعی حیثیت بھی معلوم ہوگئی، ملک و قوم کی اجتماعی ضرورت کے لیے اہلِ علم نے ٹیکس لگانے کی اجازت دی ہے، فقہ کا ایک ماخذ "مصالح" ہیں، مصالح کے تحت علماء نے "ٹیکس" کی شرعی حیثیت پر بحث کی ہے [illegible]

[illegible]

البتہ یہ ضروری ہے کہ واقعی ضروریات کے لیے مناسب ٹیکس لگایا جائے اور اس معاملہ میں اس بے اعتدالی اور لوٹ کھسوٹ کو راہ نہ دی جائے جو آج سرمایہ دارانہ نظام کے لوازم میں ہے۔

حکومت اسلامی ہو یا غیر اسلامی، ٹیکس کی حیثیت "عبادت" کی نہیں، اس لیے یہ زکوٰۃ کا بدل نہیں، نہ اس میں زکوٰۃ کی نیت درست ہوگی، نہ ٹیکس ادا کرنے کی وجہ سے زکوٰۃ معاف ہوگی۔

❀❀❀❀❀❀

اسلام کا نظام عشر و زکوٰۃ

باب: ۹

صدقات واجبہ

صدقاتِ نافلہ

زکوٰۃ و عشر اور صدقات واجبہ کی مختلف صورتیں جو ذکر کی گئی ہیں، وہ سب انفاق کی قانونی صورتیں ہیں، یہ وہ کم سے کم درجہ ہے جو ہر مسلمان پر بہ طور ایک لازمی ذمہ داری کے عائد ہوتی ہے، یہی منشا ہے، اس حدیث نبوی ﷺ کا جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد کوئی اور ذمہ داری نہیں رہتی، (۱) لیکن انفاق کا ایک احسانی درجہ ہے جو اس سے بہت فزوں ہے، جب انسان کا ایمان اس کو باور کراتا ہے کہ متاع دنیا جو کچھ اس کے پاس موجود ہے وہ سب خدا کی امانت ہے، خدا کی راہ میں اس کا جتنا زیادہ حصہ صرف ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے کہ وہ بار امانت سے سبکدوش ہوگا، اور حساب و کتاب کی ذمہ داری سے فراغت حاصل ہوگی۔ اسلام کے اولین حاملین جن کے سینوں کو خود پیغمبر اسلام ﷺ نے حرارت ایمانی کا آتش کدہ بنا دیا تھا، نے جب دریافت کیا کہ اللہ کی راہ میں انہیں کیا کچھ خرچ کرنا چاہیے؟ تو فرمایا گیا: ضروریات زندگی سے جو کچھ بچ رہے

یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو ۔ (بقرہ ۲۱۹)

لوگ آپ ﷺ سے استفسار کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہیے ضرورت سے جو بھی بچ رہے۔

اور رسول کے ان اصحاب نے تن، من، دھن اور دل و ضمیر کی طرح اپنی پوری کائنات بھی رسول کے قدموں میں ڈال دی۔ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ،

---

(۱) ترمذی عن ابی ہریرہ ۱/۱۳۳ باب ماجاء اذا ادیت الزکوٰۃ فقد قضیت ما علیک

ترمذی عن فاطمہ بنت قیس ۱/۱۳۳ باب ماجاء ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ

آپ ﷺ نے اپنے مختلف ارشادات میں اس بات کی تلقین فرمائی ہے کہ زکوٰۃ اور مقررہ واجبات کو ادا کر کے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مال کا پورا پورا حق ادا کر دیا گیا ہے، بلکہ زکوٰۃ کے سوا بھی حقوق ہیں، (۱) ایک بار فرمایا کہ ہر مسلمان پر صدقہ ہے، دریافت کیا گیا اگر اس کی استطاعت نہ ہو! ارشاد فرمایا محنت مزدوری کرے، خود بھی اس کمائی سے نفع اٹھائے اور صدقہ بھی کرے، پوچھا گیا اگر ایسا بھی نہ کر سکے؟ فرمایا کہ کسی مظلوم و کمزور فریادی کی (جسمانی) مدد ہی کر دے، (۲) حضرت ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے انسان کو صدقہ کرنا چاہیے، (۳) ایک بار فرمایا تم میں سے ہر شخص کو دوزخ سے بچنے کی سعی کرنی چاہیے اس کے لیے صدقہ کرنا چاہیے، چاہے کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، (۴) ایک روایت میں ہے کہ مسلمان درخت لگائے، کاشت کرے اور اس میں سے کوئی انسان یا جانور یا کوئی اور چیز کھالے تو یہ بھی اس کے لیے صدقہ ہوگا۔ (۵)

انسانی خدمت کی اہمیت کو آپ ﷺ نے ایک روایت میں بڑے موثر انداز میں ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انسان سے مخاطب ہوں گے اور فرمائیں گے:

ابن آدم! میں بیمار ہوا تم نے عیادت نہیں کی، بندہ کہے گا، پروردگار! آپ تمام عالم کے رب ہیں کیوں کر آپ کی عیادت کروں گا؟، فرمائیں گے کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا، تم نے مزاج پرسی نہیں کی، اگر کی ہوتی تو وہاں مجھے موجود پاتے، اسی طرح سوال ہوگا، میں نے کھانا مانگا تم نے نہیں کھلایا اور پانی طلب کیا، تم نے نہیں پلایا، بندہ تحیر کے ساتھ کہتا جائے گا کہ آپ تمام عالم کے پالن ہار، میری کیا مجال کہ آپ کو کھلاؤں پلاؤں؟، اللہ تعالیٰ بھوکے اور پیاسے انسانوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمائیں گے کہ اگر تم نے ان کو کھلایا پلایا ہوتا، تو مجھے وہاں موجود پاتے، (۶) اور کیوں نہ ہو جس پیغمبر رحمۃ للعالمین ﷺ اور اس کی شریعت رحمت پناہ نے جانوروں اور کتوں کو بھی اپنے دامانِ رحمت میں پناہ دی ہو، اور کتے کو پانی پلانے کو خدا کی مغفرت و بخشش کا سامان

---

(۱) ترمذی عن فاطمہ بنت قیس ۱/۱۴۳ (۲) بخاری ۱/۱۹۴ عن ابی موسیٰ اشعری، باب صدقۃ الکسب والتجارۃ

(۳) مسلم عن ہمام بن منبہ ۱/۳۲۵ باب بیان ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف۔

(۴) بخاری ۱/۱۹۰ عن عدی ابن حاتم، باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ

(۵) بخاری عن انس بن مالک ۱/۳۱۲ باب فضل الزرع والغرس

(۶) مسلم عن ابی ہریرہ باب فضل عیادۃ المریض من کتاب البر والصلۃ

بتایا ہو، (۱) اس نے اگر انسانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہو تو یہ اس دین و شریعت کے مزاج کے عین مطابق ہے۔

اعتدال و میانہ روی کی تلقین

تاہم شریعتِ اسلامی میں قدم قدم پر جو توازن و اعتدال برتا گیا ہے اس کا اس باب میں بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، عام حالات میں اس طرح انفاق اور صدقہ کہ اہل حق محروم ہو کر رہ جائیں اور آج صدقہ کیا جائے اور کل خود دستِ سوال دراز کرنا پڑے، پسندیدہ طریقہ نہیں ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو ضرورت سے بچ رہنے پر دیا جائے خیر الصدقة ما كان عن ظهر غنى. (۲) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی محتاج ہو تو پہلے اپنے آپ پر خرچ کرے، پھر بچ رہے تو اہل و عیال پر، پھر بچ رہے تو قرابت داروں پر، اگر اس کے بعد بھی بچ رہے تو پھر اوروں پر خرچ کرے۔ (۳)

اس اصول کی رعایت آپ ﷺ نے وصیت میں بھی فرمائی، سعد بن مالکؓ بیمار تھے حضور ﷺ نے عیادت فرمائی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کچھ وصیت بھی کی ہے؟ میں نے عرض کیا، میرا پورا مال راہِ خدا میں وقف ہے، فرمایا: بچوں کے لیے کچھ چھوڑا ہے؟ حضرت سعدؓ نے فرمایا: وہ سب بحمد اللہ خوش حال ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا، دس فی صد کی وصیت پر اکتفا کرو، وہ اس کو کم قرار دیتے رہے، اخیر میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک تہائی کی زیادہ سے زیادہ وصیت کرو اور ایک تہائی بھی بہت ہے، (۴) ——— جہاں صدقہ کی ترغیب کے ذریعہ اسلام نے غرباء کی طرف توجہ دلائی ہے، وہیں قرابت مندوں اور رشتہ داروں کو پہلے رکھ کر اور ان کے حقوق و مراعات کو مقدم کر کے اس نے ان کو بے التفاتی سے بچایا ہے اور اعتدال و توازن پیدا کیا ہے۔

---

(۱) بخاری عن ابی ہریرہ ۱/۳۱۸ باب فضل سقی الماء

(۲) بخاری ابواب الزکوۃ، باب لا صدقۃ الا عن ظہر غنی

(۳) مسلم عن جابر ۱/۳۲۲ باب الابتداء فی النفقۃ بالنفس ثم اھلہ ثم القرابۃ

(۴) ترمذی، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی الوصیۃ بالثلث والربع

فقہاء کی تصریحات

فقہا نے شریعت کی انھیں تعلیمات کو سامنے رکھ کر صدقاتِ نافلہ کے احکام بیان کیے ہیں، ابن قدامہ کا بیان ہے :

صدقہ تمام اوقات میں مستحب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : کون ہے جو خدا کو قرض حسنہ دے کہ اللہ تعالیٰ اس کو چند در چند کر دیں (بقرہ ۲۴۵) نیز اس کے علاوہ بھی بہت سی آیات میں صدقہ کا حکم دیا گیا ہے، اس پر ابھارا ہے اور ترغیب دی ہے —— بہتر ہے کہ اپنی اور اپنے مستقل زیر پرورش لوگوں کی ضروریات اور کفایت سے جو بچ رہے اس میں سے صدقہ کریں، اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو ضروریات سے فراغ کے بعد ہو ماكان عن ظهر غنى اور پہلے ان لوگوں پر خرچ کرو جو تمہارے زیر پرورش ہیں۔ اگر اپنے زیر پرورش بے روزگار لوگوں کی حق تلفی کر کے صدقہ کریگا تو گنہ گار ہوگا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی شخص کے گنہ گار ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ اپنے زیر پرورش لوگوں کو ضائع کر دے، نیز زیر پرورش لوگوں کا نفقہ واجب ہے، اور صدقہ نافلہ نفل ہے اور نفل کو فرض سے مقدم رکھنا جائز نہیں، اگر آدمی تنہا ہو یا زیر پرورش لوگوں کے لیے سامان کفایت ہو اور تمام مال صدقہ کرنا چاہے یا باروزگار ہو یا اپنے آپ پر پورا اعتماد ہو کہ فقر و محتاجی پر صبر و توکل کا ثبوت دے سکے گا اور دوسروں کے سامنے دستِ سوال پھیلانے سے خود کو بچا سکتا ہو تو یہ بہتر ہے۔(۱)

ممتاز حنفی فقیہ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں :

اپنی اور اپنے زیر پرورش لوگوں کی ضروریات سے فاضل مال میں سے صدقہ کرنا مستحب ہے، اگر زیر پرورش لوگوں کی کفالت میں کمی کر کے صدقہ کرے تو گنہ گار ہوگا، جو شخص پورا مال صدقہ کرنا چاہے اور اپنے بارے میں توکل و قناعت اور سوال سے صبر و اجتناب کا یقین رکھتا ہو اس کے لیے ایسا کرنا جائز

(۱) المغنی ۲/۳۶۸ فصول فی صدقۃ التطوع

ہے، ورنہ جائز نہیں۔ جو لوگ تنگدستی برداشت نہیں کر سکتے ان کے لیے اپنی مکمل کفایت کی مقدار میں کمی کر کے صدقہ کرنا جائز نہیں۔

آگے علامہ شامی نے علامہ سرخسی سے نقل کیا ہے کہ :

نفل صدقہ کرنے والوں کے لیے افضل ہے کہ تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے (اجر کی) نیت کر لیں، اس طرح سبھوں کو ثواب پہنچے گا اور خود اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔(۱)

ماعون

یہ تو صدقات نافلہ کے عمومی احکام ہیں، لیکن صدقات کی کچھ خاص خاص صورتیں ہیں جن کا قرآن مجید یا حدیث میں ذکر آیا ہے ان میں ایک "ماعون" ہے، ارشاد باری ہے :

ان نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں، جو دکھاوا کرتے ہیں اور ماعون (روزمرہ ضرورت کی معمولی چیزیں) تک روک لیتے ہیں۔

ويل للمصلين الذين هم عن صلاتهم ساهون الذين هم يراء ؤن و يمنعون الماعون . (ماعون-۷)

حضرت ام عطیہؓ سے منقول ہے کہ ماعون وہ اشیاء ہیں جو باہم لیا دیا کرتے ہیں "ما يتعاطاه الناس" رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ گھریلو سامان مراد ہیں جو عاریۃً دیے جاتے ہیں، بعضوں نے ڈول، ہانڈی وغیرہ کو ماعون کہا ہے،(۲) امام ابو بکر جصاص رازی نے لکھا ہے کہ ماعون میں یہ تمام ہی باتیں داخل ہیں، ان کا روکنا مذموم، دناءت اور اسلامی اخلاق کے مغائر ہے،(۳) ماعون میں بخل و کم ظرفی کے سلسلے میں قرآن مجید نے جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "ماعون" کا لین دین واجب ہے لیکن اگر اس کو واجب و ضروری نہ سمجھا جائے اور اخلاقی ہدایت ہی باور کیا جائے تب بھی "صدقات نافلہ" میں سے ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

(۱) ردالمحتار ۲/۷۱ قبیل باب صدقۃ الفطر (۲) الدر المنثور ۸/۶۴۴

(۳) احکام القرآن ۳/۴۷۵

زرعی پیداوار اور پھلوں میں سے

قرآن مجید نے اس سلسلے میں جوایک اور ہدایت دی ہے، وہ یہ کہ جب کھیتی کاٹی جائے تو اس موقع سے غریبوں اور ناداروں کا خیال کیا جائے۔

هوالذى انشأ جنت معروشت وغير معروشت والنخل والزرع مختلفا اكله والزيتون والرمان متشابها وغير متشابه كلوا من ثمره اذا اثمر واتوا حقه يوم حصاده ولا تسرفوا انه لايحب المسرفين . (انعام ۱۴۱)

اور وہی تو ہے جس نے باغ پیدا کیے (ٹٹیوں پر) چڑھائے ہوئے اور بغیر چڑھائے ہوئے اور کھجور کے درخت اور کھیتی کہ ان کے کھانے کی چیزیں مختلف ہوتی ہیں اور زیتون اور انار باہم مشابہ (بھی) اور غیر مشابہ (بھی،) اس کے پھلوں میں سے کھاؤ جب وہ نکل آئے اور اس، حق (شرعی) اس کے کاٹنے کے دن ادا کر دیا کرو اور اسراف مت کیا کرو، بیشک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

بعضوں کا خیال ہے کہ اس سے پیداواری عشر مراد ہے۔ ایک رائے ہے کہ یہ حکم زکوۃ وعشر کی فرضیت سے پہلے کا ہے، البتہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور مشہور مفسر مجاہد کا خیال ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں، اور یہ عشر وزکوۃ کے علاوہ واجب ہے، کھیتی کاٹتے ہوئے، کھلیان میں رہتے ہوئے اور ان کو روندتے ہوئے کچھ غربا کے لیے چھوڑ دیا جائے،(۱) علامہ ابن حزم نے بھی اس کو واجب قرار دیا ہے اور اس کو زکوۃ وعشر سے مختلف قرار دیا ہے۔(۲)

خیال ہوتا ہے کہ یہ آیت زکوۃ وعشر سے متعلق ہے کہ مکہ میں نازل ہوئی ہے، اور اس میں پھلوں کی جو تفصیلات مذکور ہیں، اس طرح کی تفصیل کے ساتھ مکہ میں زکوۃ کے احکام نہ نازل ہوئے اور نہ زکوۃ وعشر کا عملی نفاذ عمل میں آیا، نہ اس کے منسوخ ہونے پر کوئی دلیل موجود ہے بلکہ یہ ایک اخلاقی ہدایت ہے کہ کھیتیوں اور باغوں کے مالک کھیتوں کی کٹائی اور پھلوں کے توڑے جانے کے وقت اپنی اس خوشی میں سماج کے غریب بھائیوں کو بھی شریک کرلیں۔

قرآن نے اس طرح کا حکم ایک اور موقع پر بھی دیا ہے کہ جب ترکہ تقسیم کیا جائے اور وہاں وہ

---

(۱) حوالۂ سابق ۹/۳ (۲) المحلی ۲۱۶/۵

اعزہ بھی آجائیں جو وراثت سے محروم ہو جائیں تو اس موقع پر ان کو کچھ دیدیا جائے،(نساء-۸۶) یہ اسلام کے مروت ورواداری کے مزاج کے عین مطابق ہے۔

مہمان کا حق

حدیث میں جن لوگوں کے حقوق کی طرف خصوصی توجہ دلائی گئی ہے، ان میں ایک مہمان بھی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ تم سے ملاقات کو آنے والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ ان لزورك عليك حقا (۱) اس حدیث کی وجہ سے بعض حضرات نے تو مہمان کی ضیافت کو واجب قرار دیا ہے، لیکن اکثر علما کا خیال ہے کہ یہ مستحب ہے اور تقاضۂ اخلاق ہے، حضرت ابو شریح کعبیؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، ان کو مہمان کے ساتھ تکریم کا معاملہ کرنا چاہیے، ایک دن و رات "جائزہ" یعنی اپنی حیثیت کے لحاظ سے خصوصی لحاظ واہتمام ہے۔ اور تین دنوں عمومی ضیافت، اس کے بعد صدقہ ہے،(۲) "جائزہ" کے اصل معنی انعام کے ہیں، یہ تعبیر بتلاتی ہے کہ یہ حکم مکارم اخلاق اور صدقات نافلہ کے باب سے ہے نہ کہ واجبات ولوازم میں سے۔(۳)

جانوروں میں

آپ ﷺ نے جانوروں میں بھی دوسرے غریب بھائیوں کا حق رکھا ہے، عرب میں اکثر علاقے ریگستانی ہیں، کہیں کہیں پانی کے چشمے مل جاتے ہیں، یہیں اہل مویشی اپنے مویشی لاتے اور پانی پلاتے، ضرورت مند وغریب لوگوں کے لیے بھی یہ پناہ گاہ ہوتی، مالکان مویشی آتے، دودھ دوہتے، تو کچھ ان غریبوں کو بھی دیدیتے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے نہ صرف عربوں کی اس روایتی غریب پروری کو باقی رکھا بلکہ اس کو دودھ دینے والے مویشیوں میں ایسے فقرا کا حق قرار دیا اور چونکہ زیادہ تر عربوں کی غذائی ضروریات کا انحصار اونٹنی کے دودھ پر تھا اس لیے خاص طور پر اونٹنی کے بارے میں فرمایا کہ اس کا حق ہے کہ ایسے مقام پر دوہی جائے

---

(۱) بخاری ۲۶۵/۱ کتاب الصوم ، باب حق الضیف فی الصوم
(۲) بخاری ۹۰۶/۲ کتاب الادب ، باب اکرام الضیف الخ
(۳) دیکھیے نیل الاوطار ۱۵۶/۸ ، ابواب العید ، باب ماجاء فی الضیافۃ

من حق الابل ان تحلب علی الماء . (١) علامہ ابن حزم نے تو اپنے مزاج ومذاق کے مطابق اس کو بھی واجبات میں شمار کیا ہے، (٢) لیکن عام اہلِ علم نے اس کو بھی مکارم اخلاق اور آداب معاشرت کے درجہ میں رکھا ہے اور مستحب قرار دیا ہے۔ (٣)

سوال کرنے والوں کی مدد

قرآن وحدیث میں جن لوگوں کی مدد واعانت کی تاکید کی گئی ہے، انھیں میں سائلین بھی ہیں، اسلام نے سوال اور گداگری کی حوصلہ افزائی نہیں کی ہے لیکن اگر کوئی سوال اور ضرورت کا اظہار کرے تو اس کی بھی تاکید کی ہے کہ اس کو ممکن حد تک خالی ہاتھ نہ لوٹایا جائے، خود قرآن مجید نے نیکی کی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے سائلین کی مدد کا بھی ذکر کیا ہے، (بقرہ-١٧٧) حجۃ الوداع کے موقع سے دو اصحاب بارگاہ قدسی میں آئے اور عرض کناں ہوئے کہ ان کو کچھ دیا جائے، وہ بہ ظاہر طاقت ور اور کسب معاش کے اہل تھے، آپ ﷺ نے ایک نظر ان کو دیکھا پھر فرمایا کہ چاہو تو تم کو دیدوں، لیکن اس میں درحقیقت اہلِ دولت اور کمانے اور محنت کرنے کی طاقت رکھنے والوں کا کوئی حصہ نہیں (٤) اس سے معلوم ہوا کہ سوال کرنے والوں کے اظہار پر اعتماد کرنا چاہیے، ایک روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ سائل گھوڑے پر بھی آئے تب بھی اس کی مدد کی جائے، منشا یہ ہے کہ لوگوں کے اندرونی حالات کا اس کی ظاہری حالت پر فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، بہت سے اصحاب عزت اپنی غربت پر شرافت ووقار کا پردہ ڈالے رہتے ہیں، اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔

حضرت ام بجید جن کو رسول اللہ ﷺ سے بیعت کا شرف حاصل تھا، راوی ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ بعض اوقات مسکین میرے دروازے پر کھڑے ہوتے ہیں اور میرے پاس ان کو دینے کے لیے کچھ نہیں رہتا، حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ کچھ نہ ملے اور ایک جلا ہوا کھر میسر ہو تو وہی اس کو دیدو، (٥) اگر خود میسر نہ ہو تو کسی اور سے دلانا اور سفارش وگزارش کرنا بھی مستحب ہے، چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نقل

(١) بخاری ١/٣٢٠ باب حلب الابل علی الماء، (٢) المحلی ٦/٥٠
(٣) دیکھیے: عمدۃ القاری، باب حلب الابل علی الماء، (٤) ابوداؤد عن عبداللہ بن عمرو، حدیث نمبر: ١٦٣٣
(٥) ترمذی ١/١٤٤ ابواب الزکوٰۃ، باب ماجاء فی حق السائل

کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی سائل آتا اور آپ ﷺ کے سامنے کوئی ضرورت پیش کی جاتی تو فرماتے کہ ان کے لیے سفارش کرو، اجر پاؤ گے، اشفعوا تو جروا. (١)

قربانی

تیوہار کے مواقع اجتماعی خوشی اور مسرت کے ہوتے ہیں، ایسے موقع پر خاص طور سے غریبوں کا خیال رکھا گیا، عید الفطر کے موقع سے تو "صدقۃ الفطر" کا حکم دیا گیا اور خاص کر غریبوں اور محتاجوں کو ہی اس کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ عید الاضحیٰ کے موقع سے ہر صاحبِ استطاعت پر قربانی واجب قرار دی گئی، (٢) گو قربانی کا گوشت قربانی کرنے والا بھی کھا سکتا ہے اور دوسرے مال داروں کو بھی دے سکتا ہے لیکن مسنون ومستحب طریقہ ہے کہ اس کے تین حصے کیے جائیں اور اس میں سے ایک حصہ فقراء اور ناداروں کو دیا جائے، (٣) لیکن قربانی کے جانور کا چمڑا یا کوئی اور حصہ جسم فروخت کردیا جائے تو پھر اب اس کی قیمت کا مصرف صرف فقراء ہی ہیں اور انھیں پر اس کا خرچ کرنا واجب ہے۔ غرض گوشت وچرم اپنی اصلی حالت میں صدقہ نافلہ ہے اور فروخت کیے جانے کے بعد صدقات واجبہ میں ہے۔

عقیقہ

اولاد انسان کے لیے اللہ کی رحمت ہے، اولاد کی پیدائش پر مسرت وخوشی انسانی فطرت ہے۔ اس خوشی کے موقع پر بھی اسلام نے غریبوں کو فراموش نہیں کیا اور دو ایسے احکام دیے کہ ان کے ذریعہ اس موقع مسرت میں بھی ان کو شریک کیا جاسکے، ایک یہ کہ ولادت کے ساتویں دن مولود کے سر کے بال مونڈ کر اس کے ہم وزن چاندی صدقہ کردی جائے، حضرت حسنؓ کی پیدائش پر حضرت فاطمہؓ اور زینبؓ نے بالوں کے ہم وزن چاندی صدقہ فرمائی ہے (٤) دوسرے عقیقہ کا حکم فرمایا، حضرت ام کرزؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، لڑکے کا عقیقہ دو بکرے اور لڑکیوں کا ایک بکرے سے کیا جائے، (٥) دو بکرے میسر نہ ہوں تو ایک ہی

(١) بخاری ١/١٩٢ کتاب الزکوٰۃ
(٢) قربانی احناف کے ہاں واجب اور دوسرے فقہا کے ہاں سنتِ موکدہ ہے۔ المغنی ٨/٦١٧، رحمۃ الامۃ ١٣٨
(٣) ہدایہ ٤/٤٤٣ (٤) موطا امام مالک عن جعفر بن محمد (٥) ابوداؤد، باب فی العقیقہ

بکرے سے لڑکے کا عقیقہ بھی کیا جا سکتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت حسنؓ اور حسینؓ کا عقیقہ آپ ﷺ نے ایک ہی مینڈھے سے کیا(۱) یہ بھی اپنی خوشی میں دوسروں کو شریک کرنے کی ترغیب اور سماج کے غریب لوگوں کی مدد کی ایک صورت ہے۔

ولیمہ

یہی روح دعوت ولیمہ میں کار فرما ہے، آپ ﷺ نے نکاح کے بعد خاص طور سے ولیمہ کی تاکید فرمائی اور خود بھی معمول رکھا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نکاح ہوا تو ہدایت فرمائی کہ ایک بکرے سے ولیمہ کرو **اولم ولو بشاة**(۲) ولیمہ کا مقصود جہاں نکاح اور حلال رشتہ کی تشہیر ہے وہیں یہ بھی خوشی کی اس تقریب میں دوسروں کو بھی شریک کیا جائے اور خاص کر غریبوں کا پاس لحاظ رکھا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بدترین ولیمہ وہ ہے جس میں غریبوں کی شرکت نہ ہو۔

یہ اور اس طرح کے تمام احکام کا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں میں اجتماعیت پیدا ہو، ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ ابھرے، دولت مند اپنی دولت میں غریبوں کا حق محسوس کریں، ایثار کی توفیق ہو، انفاق اور امداد و اعانت کا عام ذہن بنے، غم اور خوشی اور تکلیف اور راحت میں ایک دوسرے کا ساتھ ہو، خود غرضی کا مزاج نہ پیدا ہو، فرائض و واجبات سے آگے بڑھ کر باہمی تعاون کا یہ پاس وخیال پروان چڑھے۔

انفاق کا احسانی معیار

پس، زکوٰۃ اور مقررہ واجبات کی ادائیگی وہ کم سے کم ذمہ داری ہے جو انسان کو آخرت کی بازپرس سے بچاتی ہے، یہ آخری سرحد ہے جس سے تجاوز حدود اللہ کو پھاندنے کے مرادف ہے، یہ فقہ و قانون کی کھینچی ہوئی لکیر ہے جو مومن کو کافر سے ممتاز کرتی ہے، لیکن وہ ایمان جو اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ مومن نے اپنے آپ کو خدا کے ہاتھوں فروخت کر لیا ہے (توبہ-۱۱۱) وہ اپنی رگ جاں کا مالک بھی نہیں ہے وہ اور اس کا مال و متاع، یہاں تک کہ اس کی زندگی اور موت بھی اس کے خدا کے لیے ہے۔ **ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین،**

(۱) سبل السلام ۱۳۲۶/۴ باب العقیقہ (۲) بخاری ۷۷۲/۲

(انعام-۱۶۲) اس کی کمائی کا بہتر حصہ وہ ہے جو خدا کی خوشنودی کی طلب میں صرف ہو جائے، جو بیماروں کے مشقت کدوں میں اور بھوکوں اور پیاسوں کی اندھیری کوٹھریوں میں خدا کے وجود کو پاتا ہے، مظلوموں اور ستم رسیدوں کی مدد اور کمزوروں اور مجبوروں کی اعانت میں خدا کے دامن رحمت کے تھامنے کا ادراک رکھتا ہو، اس کے لیے اللہ کی راہ میں انفاق اور بندگان خدا کی نصرت اور خدمت کے لیے کوئی حد نہیں، وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زبان میں سمجھتا ہے کہ جو کچھ خرچ ہوا وہ بچ رہا کہ خزانۂ آخرت میں محفوظ ہے اور جو کچھ اپنے آپ پر خرچ ہوا، وہ ختم ہوا کہ فانی وجود پر صرف ہوا اور خود بھی فنا ہوا!

باب: ۱۱

زکوٰۃ و عشر کے ضروری احکام

زکوٰۃ وعشر کے ضروری احکام

"زکوٰۃ وعشر کے جو احکام مختلف ابواب میں ذکر کئے گئے، کثرت سے فقہا کا اختلاف، بہت سے مقامات پر فقہا کی دلیلیں اور بعض جگہ اس کو تاہ علم کے اپنے نقطہ نظر کا ذکر آیا ہے، اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ عام لوگوں کے لیے اختلاف اور دلیل وغیرہ چھوڑ کر ضروری اور اصل احکام آسان زبان میں نقل کردئے جائیں ـــــ یہ باب اسی ضرورت کی تکمیل ہے۔"

شرائطِ زکوٰۃ

۱ - زکوٰۃ اس شخص پر واجب ہوتی ہے جو مسلمان، عاقل اور بالغ ہو، نابالغ بچوں کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں،(۱) پاگل کے مال میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔(۲)

۲ - زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مالِ زکوٰۃ مکمل طور پر اس کی ملکیت میں ہو،(۳) رہن رکھی ہوئی چیز پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی،(۴) البتہ امانت رکھی ہوئی چیز میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور اصل مالک اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا،(۵) بینک اور فکسڈ ڈپازٹ میں رکھی ہوئی رقم پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۳ - قرض دی ہوئی رقم یا تجارتی سامان کی قیمت باقی ہو، اور جس کے ذمہ باقی ہو وہ اس کا اقرار

---

(۱) ہدایہ مع الفتح ۱۱۵/۲ (۲) حوالہ سابق

(۳) تاتارخانیہ ۲۱۷/۲ (۴) عالم گیری ۱۷۲/۱

(۵) فتح القدیر ۲۲۱/۲

بھی کرتا ہو اور بظاہر اس قرض کی وصولی کی توقع ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، فی الحال بھی ادا کر سکتا ہے، اور قرض وصول ہونے کے بعد بھی پوری مدت کی زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے، قریب قریب یہی حکم ان بقایا جات کا ہے جو اجرت و مزدوری، کرایہ مکان و سامان یا رہائشی مکان کی قیمت وغیرہ کے سلسلے میں ہے، اور وصولی متوقع ہو، ان پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، خواہ ابھی ادا کر دے یا قرض وصول ہونے کے بعد، (۱) ایسا قرض کہ جس کی وصولی کی توقع نہ ہو، لیکن وصول ہو گیا یا قرض کسی مال کے بدلہ میں نہ ہو جیسے مہر اور بدل خلع وغیرہ، مقروض دیوالیہ ہو اور وصولی کی امید نہ ہو، قرض کا انکار کرتا ہو اور مناسب ثبوت موجود نہ ہو، ان تمام صورتوں میں جب بقایا جات وصول ہو جائیں اور سال گذر جائے تب ہی زکوٰۃ واجب ہوگی، اس سے پہلے نہیں۔ (۲)

ضروری اور استعمالی چیزوں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اور ان کو مستثنیٰ کر کے ہی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، ایسی ہی اشیاء کو فقہ کی اصطلاح میں "حاجت اصلیہ" کہتے ہیں، رہائشی مکانات، استعمالی کپڑے، سواری کے جانور یا گاڑی، حفاظت کے ہتھیار، زیبائش و آرائش کے سامان، ہیرے جواہرات، یاقوت، قیمتی برتن وغیرہ میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، (۳) صنعتی آلات اور مشینیں جو سامان تیار کرتی ہیں اور خود باقی رہتی ہیں، کرایہ کی گاڑیاں، ان چیزوں میں بھی زکوٰۃ نہیں، البتہ رنگریز جو کپڑے رنگنے کا پیشہ رکھتا ہو، اس کے پاس محفوظ رنگ میں زکوٰۃ واجب ہوگی، (۴) جو کتابیں مطالعہ کے لیے ہوں ان میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں، (۵) البتہ ان ذکر کی گئی چیزوں میں سے کسی بھی چیز کی تجارت کی جائے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

سال کا گذرنا

مختلف مالوں میں زکوٰۃ کا جو نصاب شریعت نے مقرر کیا ہے، اس کے مالک ہونے کے

---

(۱) تاتارخانیہ ۲/۳۰۱، بدائع ۲/۲۱۰ (۲) بدائع ۲/۲۱۰

(۳) عالم گیری ۱/۱۷۲، ہدایہ مع الفتح ۲/۱۱۹ (۴) فتح القدیر ۲/۱۲۱

(۵) فتح القدیر ۱/۱۲۰

بعد سال گذر جائے تب ہی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، البتہ اس سے زرعی پیداوار اور پھل مستثنیٰ ہیں، کھیت جونہی کٹے اور پھل توڑے جائیں اسی وقت عشر نکال دینا ضروری ہے۔ (۱)

سونا چاندی، نقد رقم اور تجارتی سامانوں میں اصول یہ ہے کہ اگر اس مال کا کچھ حصہ بھی باقی رہے تو درمیان سال میں کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اختتام سال پر مقدار نصاب یا اس سے زیادہ جتنا مال موجود ہو، اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی (۲) مثال کے طور پر یکم رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ کو پہلی بار نصاب زکوٰۃ کا مالک ہوا۔ سال کے درمیان رقم گھٹتی اور بڑھتی رہی۔ لیکن اگلے سال کی یکم رمضان المبارک کو پھر اس کے پاس نصاب زکوٰۃ موجود ہے یا درمیان سال میں مال کے اضافہ کی وجہ سے وہ دو تین نصاب کا مالک ہو چکا ہے تو اب اسے یہ کرنا ہوگا کہ دوسرے سال یکم رمضان المبارک کو اپنی ملکیت میں موجود سونا، چاندی، نقد رقم، بینک میں محفوظ رقم، دوکان میں موجود تجارتی سامان سب کی مجموعی قیمت جوڑ لے، کچھ قرض اس کے ذمہ باقی ہو تو اس کو منہا کر کے اور بقیہ رقم میں ڈھائی فی صد یعنی ایک ہزار پر پچیس کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کر دے۔

واضح ہو کہ سال سے قمری یعنی چاند والا سال مراد ہے۔

دَین کی منہائی

اگر کسی کا قرض باقی ہو تو اس کو منہا کر کے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے (۳) البتہ عشر سے دَین منہا نہیں کیا جا سکتا، جتنی پیداوار ہو اس کا عشر ادا کرنا ہوگا، (۴) فی زمانہ بیوی کا مہر جو شوہر کے ذمہ واجب ہو اس کو بھی زکوٰۃ سے منہا نہیں کیا جائے گا۔ (۵)

صنعتی اور ترقیاتی قرضے جو سرکاری یا غیر سرکاری اداروں سے حاصل کیے جاتے ہیں اور انہیں طویل مدت یعنی دس بارہ سال میں ادا کرنا ہوتا ہے، اس میں اصول یہ ہے کہ ہر سال قرض کی جتنی قسط ادا کرنی ہے اس سال اتنی رقم منہا کر کے زکوٰۃ کا حساب کیا جائے گا نہ کہ

---

(۱) المغنی ۲/۲۹۷ (۲) بدائع الصنائع ۲/۱۳

(۳) عالم گیری ۱/۱۷۳ (۴) شامی ۲/۲۰۶

(۵) تاتارخانیہ ۲/۲۹۱

پورے قرض کا۔(۱)

اموالِ زکوٰۃ

شریعت نے ہر مال میں زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی ہے بلکہ خاص خاص مال ہی ہیں جن میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور وہ یہ ہیں:

معدنی اشیاء میں: سونا، چاندی، کاغذی نوٹ اور رائج الوقت سکے بھی فی زمانہ سونے چاندی ہی کے حکم میں ہیں۔

سامانِ تجارت: کوئی بھی سامان جس کی خرید وفروخت کی جائے۔

مویشیوں میں: اونٹ، بھینس، گائے، بیل، بکریاں اور گھوڑے۔

زمینی پیداوار: تمام اجناس، پھل اور ترکاریاں۔

زکوٰۃ کا نصاب

زمینی پیداوار خواہ کتنی بھی ہو، اس میں عشر واجب ہوگا، لیکن سونا، چاندی، روپے، تجارتی سامان وغیرہ میں ایک مخصوص مقدار ہے، اتنی مقدار کا مالک ہونے پر ہی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اسی مقدار کو نصاب زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

۱ - سونے کا نصاب ۲۰/ مثقال سونا ہے جو ساڑھے سات تولہ اور جدید اوزان میں ۸۷ء۴۷۹ گرام ہوتا ہے۔(۲)

۲ - چاندی کا نصاب دوسو درہم ہے جو ساڑھے باون تولہ ہے اور جدید اوزان میں ۶۱۲ء۳۵ گرام ہوتا ہے۔(۳)

۳ - سامانِ تجارت قیمت یا نقد رقم جب چاندی کی اس مقدار یعنی ۶۱۲ء۳۵ گرام کی قیمت کے برابر ہوجائے تو سمجھا جائے گا وہ شخص صاحبِ نصاب ہے۔(۴)

(۱) دیکھیے: کتاب کے دوسرے باب میں عنوان "طویل مدتی قرضہ جات"
(۲) دیکھیے: کتاب کا تیسرا باب سونے چاندی کا نصاب
(۳) دیکھیے: کتاب کا تیسرا باب سونے چاندی کا نصاب
(۴) تاتارخانیہ ۲/۲۲۷، جدید فقہی مسائل ۲/۱۱۷ طبع پنجم

۴ - اگر کچھ سونا کچھ چاندی ہو، اس کے ساتھ کچھ مالِ تجارت ہو یا نقد رقم ہو تو ان سب کی قیمت لگا کر دیکھا جائے گا، اگر وہ ساڑھے ۵۲ تولہ (۶۱۲ء۳۵ گرام) چاندی کی قیمت کو پہنچ جائے تو زکوٰۃ واجب ہوجائے گی۔(۱)

۵ - نصابِ زکوٰۃ پر اگر کچھ مقدار کا اضافہ ہو مثلاً ساٹھ تولہ چاندی یا آٹھ تولہ سونا ہو تو اس زیادہ حصہ پر بھی ڈھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔(۳)

۶ - سونے چاندی میں اگر کچھ مقدار کھوٹ کی ہو اور غلبہ سونے چاندی کا ہو تو وہ پوری چیز سونا چاندی ہی کے حکم میں ہوگی۔(۴)

۷ - سونا چاندی جس صورت میں بھی ہو، اس میں زکوٰۃ واجب ہے، اسی لیے روزمرہ کے استعمالی زیورات کی بھی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔(۵)

۸ - گوٹے اور لچکے وغیرہ میں جو سونا اور چاندی ہو اس کا بھی حساب کیا جائے گا اور اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔(۶)

۹ - کوئی سامان اس وقت تجارتی سمجھا جائے گا جب اس میں دو باتوں میں سے ایک پائی جائے یا تو تجارت ہی کی نیت سے خرید کیا ہو یا پہلے سے ملکیت میں موجود تھا تو اب اس کو بیچ دے، وہ سامان جو پہلے سے موجود اور اس کی ملکیت میں موجود ہو، محض تجارت کے ارادہ سے تجارتی سامان شمار نہیں کیا جائے گا۔(۷)

۱۰ - ایسے باؤنڈز اور شیئرز جن میں سرمایہ تجارتی یونٹ میں استعمال کیا جاتا ہو، سامانِ تجارت ہی کے حکم میں ہے اور ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔(۸)

۱۱ - اگر ایک شخص کا سرمایہ ہو اور اس سے تجارت کرے اور دونوں نفع میں شریک ہوں تو سرمایہ کار تو اپنے اصل سرمایہ اور اپنے حصہ کے منافع دونوں کی زکوٰۃ ادا کرے گا جب کہ تاجر صرف اپنے حصۂ نفع کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔(۹)

(۱) تاتارخانیہ ۲/۲۲۷ جدید فقہی مسائل ۲/۱۱۷ طبع پنجم
(۲) ہدایہ مع الفتح ۲/۱۶۹ — (۳) فتح القدیر ۲/۱۵۹
(۴) فتح القدیر ۲/۱۶۱ — (۵) حلیۃ العلماء ۳/۹۲
(۶) جدید فقہی مسائل ۱/۱۰۲ — (۷) تاتارخانیہ ۲/۲۳۸-۲۳۹
(۸) جدید فقہی مسائل ۱/۱۱۴ — (۹) المغنی ۲/۲۴۰-۲۴۱

زکوٰۃ کی مقدار

سونا چاندی اور سامانِ تجارت اور نقد رقم ان تمام میں ڈھائی فی صد یعنی ایک ہزار روپے پر پچیس روپے کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی جب کہ سونا چاندی اپنے نصاب کو یعنی سونا (۸۷،۴۷۹ گرام) اور چاندی (۶۱۲،۳۵ گرام) کے وزن کو پہنچ جائے اور نقد رقم یا سامانِ تجارت جب (۶۱۲،۳۵ گرام) چاندی کی مقدار ہو جائے تو اس کا چالیسواں حصہ یعنی ڈھائی فی صد زکوٰۃ میں نکالنا ہوگا۔

مویشیوں جیسے بکریوں مرغیوں وغیرہ کی تجارت کی جائے تو ان کی قیمت بھی لگائی جائے گی اور اگر ان کی قیمت (۶۱۲،۳۵ گرام) چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو اس قیمت پر ڈھائی فی صد ہی کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہوگی(۱) زراعتی اور غیر زراعتی زمینوں کی خرید و فروخت کرتا ہو تو تجارتی سامان کی طرح اس میں بھی ڈھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔(۲)

عشر

۱ - جیسا کہ ذکر کیا گیا زمین کی تمام پیداوار میں عشر واجب ہے ایسی کاشت جس کی پیداوار انسانوں کے کھانے کے کام میں نہ آتی ہو یا ایسے درخت جن کے پھل نہ کھائے جاتے ہوں لیکن معاشی نقطہ نظر سے ان کی کاشت کی جاتی ہو جیسے گھانس اور بانس پیپر منٹ، کیوڑہ وغیرہ تو ان میں بھی عشر واجب ہوگا۔(۳)

۲ - اس مقصد کے لیے روئی اور گلاب کے پودے لگائے جائیں تو ان کی فصل پر بھی عشر واجب ہے۔(۴)

۳ - شہد میں بھی عشر واجب ہے(۵) اگر وہ تجارت کی غرض سے جمع کیا گیا ہو۔

۴ - ہندوستان کی زمینوں کے بارے میں علماء کا خیال ہے کہ یہ عشری ہیں اور ان کی پیداوار میں عشر ادا کیا جانا چاہیے۔(۶)

---

(۱) المغنی ۲/۳۳۸ (۲) حوالہ سابق
(۳) تاتارخانیہ ۲/۳۲۴ (۴) قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ۲/۲۷۶
(۵) دیکھیے: فتح القدیر ۲/۱۹۱ (۶) کتاب العشر والزکوٰۃ ص: ۶۰-۱۰۹

۵ - جو زمین بٹائی پر لگی ہو تو مالک زمین اور کاشت کار اپنے اپنے حصہ پیداوار کا عشر ادا کریں گے۔(۱)

۶ - زمین کرائے پر لگائی گئی ہو تو پیداوار اور پٹہ دار پر عشر واجب ہوگا۔(۲)

۷ - پھل نکل آنے کے بعد اگر پیشگی عشر ادا کر دے تو ایسا کرنا جائز ہے۔(۳)

۸ - عشر نکالنے کے بعد ہی پیداوار استعمال کرنی چاہیے۔(۴)

۹ - عشر واجب ہونے کے لیے پیداوار کا کوئی نصاب مقرر نہیں، کم و بیش جو بھی پیداوار ہو عشر واجب ہوگا۔(۵)

۱۰ - جو زمین پورے سال یا سال کے اکثر حصہ میں قدرتی پانی سے سیراب ہوتی ہو اس میں دسواں حصہ عشر ہوگا اور جس زمین کو پورے سال یا سال کے اکثر حصہ اپنی محنت سے سیراب کرنا پڑتا ہو اس میں بیسواں حصہ واجب ہوگا۔(۶)

۱۱ - کھیتی پر جو دوسرے اخراجات ہل بیل، مزدوری، نگرانی وغیرہ کے آئے ہوں، وہ منہا نہیں کیے جائیں گے۔(۷)

۱۲ - قرض اور دین بھی عشر سے منہا نہیں کیا جائے گا، کل پیداوار پر عشر واجب ہوگا۔(۸)

زکوٰۃ کی ادائیگی

۱ - زکوٰۃ کے فرض ہونے پر اجماع و اتفاق ہے، زکوٰۃ کی ادائی واجب ہونے کے بعد اسے بلا تاخیر اور بہ عجلت ممکنہ فوری زکوٰۃ ادا کر دینی چاہیے، بلا وجہ زکوٰۃ ادا کرنے میں تاخیر کرنا گناہ ہے۔(۹)

۲ - زکوٰۃ واجب ہونے کے بعد وہ مال جس پر زکوٰۃ ادا کرنی تھی اگر ضائع ہو جائے تو زکوٰۃ معاف ہو جاتی ہے لیکن اگر زکوٰۃ کی ادائی میں بلا وجہ تاخیر کی گئی تھی تو اس تاخیر کا وبال بہر حال اس پر پڑے گا، قصداً مال زکوٰۃ ضائع کر دے تو زکوٰۃ معاف نہیں ہوگی۔(۱۰)

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۵۶ (۲) شامی ۲/۲۵۵
(۳) بدائع ۲/۶۵ (۴) در مختار علی ہامش الرد ۲/۲۵۳
(۵) ہدایہ مع الفتح ۳/۱۸۶ (۶) ابن ماجہ ۱/۱۳۰
(۷) بدائع ۲/۶۲ (۸) بدائع ۲/۵۷
(۹) فتح القدیر ۲/۱۱۴ (۱۰) تاتارخانیہ ۲/۲۹۳

٣ - اگر کوئی شخص اپنا پورا مال صدقہ کر دے تو پورے مال کی اور نصاب کا کچھ حصہ صدقہ کر دے تو اتنے حصہ کی زکوٰۃ اس سے معاف ہو جائے گی۔(١)

٤ - نصاب زکوٰۃ کا کچھ حصہ ضائع ہو جائے تو اسی تناسب سے زکوٰۃ بھی معاف ہو جائے گی(٢)

٥ - زکوٰۃ واجب ہونے کے بعد مالکِ نصاب کا انتقال ہو جائے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وصیت کر جائے تو اس کے متروکہ مال کے ایک تہائی حصہ سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی(٣) اگر متروکہ کا ایک تہائی اتنا نہ ہو کہ اس سے متوفی کے ذمہ واجب زکوٰۃ پوری ادا ہو سکتی ہو تو اب یہ ورثاء کی مرضی پر ہوگا کہ وہ اپنے حصہ وراثت میں سے زکوٰۃ کا بقیہ ادا کر دیں۔

٦ - نصاب زکوٰۃ کا مالک ہونے کے بعد ایک یا کئی سال کی پیشگی زکوٰۃ ادا کی جا سکتی ہے،(٤)

٧ - زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے نیت کرنا ضروری ہے(٥) یا تو حقداروں کو زکوٰۃ دیتے وقت نیت کرے، یا زکوٰۃ کا مال الگ کرتے ہوئے نیت کرے ایسی صورت میں اب دیتے ہوئے نیت ضروری نہ ہوگی۔(٦)

٨ - زکوٰۃ اگر کسی شخص کے حوالہ کی جائے کہ وہ اسے فقراء میں تقسیم کر دے تو اس تقسیم کرنے والے کا نیت کرنا ضروری نہیں۔(٧)

٩ - زکوٰۃ کی مد میں سے کچھ رقم کسی مستحق کو دی گئی لیکن دیتے وقت نیت نہیں کی، بعد کو نیت کی، تو اگر نیت کرنے کے وقت وہ پیسے مستحق کے پاس موجود تھے تو وہ زکوٰۃ شمار ہوگی۔ لیکن اگر وہ شخص اس رقم کو خرچ کر چکا ہو تو وہ ادائی زکوٰۃ میں شمار نہیں ہوگی بلکہ دوبارہ ادا کرنا ہوگا۔(٨)

١٠ - کسی شخص کے ذمہ دَین باقی ہو، دَین کو معاف کر دے اور زکوٰۃ کی نیت کرے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی اور نہ اس نیت کا اعتبار ہوگا، ہاں اگر زکوٰۃ اسے دیدے اور پھر اس سے اپنا قرض وصول کر لے تو زکوٰۃ ادا ہو گئی۔(٩)

(١) ہدایہ مع فتح ٢٦-٢٧/٢
(٢) بدائع الصنائع ٢٣/٢
(٣) تاتارخانیہ ٢٩٦/٢
(٤) ردالمحتار ٢٧/٢
(٥) بدائع الصنائع ٣٠/٢
(٦) المغنی ٢٦٠/٢
(٧) ہدایہ مع الفتح ١٢٥/٢
(٨) المغنی ٢٦٥/٢
(٩) طحطاوی علی مراقی الفلاح ٤٧٠

١١ - زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے نیت اور جس کو زکوٰۃ دے رہا ہو، اس کے مصرف زکوٰۃ ہونے کی تحقیق کافی ہے، یہ ظاہر کرنا ضروری نہیں کہ زکوٰۃ دی جا رہی ہے اگر عیدی یا تحفہ کے نام سے دے دی جائے تب بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔(١)

١٢ - جس مال میں زکوٰۃ واجب ہوئی، خود اس مال کے ذریعہ بھی زکوٰۃ ادا کی جا سکتی ہے اور اس کی قیمت کے ذریعہ بھی۔ یہی حکم صدقۃ الفطر، عشر، نذر اور کفارہ کا بھی ہے۔(٢)

١٣ - قیمت کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کرنے میں اس وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا جب نصاب زکوٰۃ پر سال گذرا اور زکوٰۃ واجب ہوئی۔(٣)

١٤ - اور اس جگہ کی قیمت کا اعتبار ہے جہاں مال ہے، نہ کہ مالک کے مقام سکونت کا۔(٤)

١٥ - زکوٰۃ سے بچنے کے لیے "حیلہ" جائز نہیں اور گناہ ہے۔(٥)

زکوٰۃ کے مصارف

١ - قرآن مجید میں کل آٹھ مصارف کا ذکر کیا گیا ہے، زکوٰۃ کا انہی مدات میں سے کسی ایک یا چند میں خرچ کرنا ضروری ہے، ان میں سے ایک مد یعنی "غلام" کا اب وجود نہیں، ایک مد "مؤلفۃ القلوب" حنفیہ کے یہاں منسوخ ہے، اس طرح کل چھ مصارف باقی رہ گئے ہیں اور وہ یہ ہیں:

١ - فقیر یعنی وہ شخص جو بالکل نادار ہو۔

٢ - مسکین جس کے پاس سامانِ کفایت کا کچھ حصہ ہو لیکن پورا نہیں، اور ابھی اس کی حاجت باقی ہو۔(٦)

٣ - عاملین یعنی جن کو زکوٰۃ و عشر وغیرہ کی وصولی کے لیے مقرر کیا گیا ہو(٧) یہ صاحب نصاب ہوں تب بھی انھیں زکوٰۃ میں سے ان کے کام کی اجرت کے طور پر زکوٰۃ دی جا سکتی ہے اور وہ لے سکتے ہیں،(٨) زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کے لیے اور تحریر وغیرہ کے لیے

(١) ردالمحتار ٨٦/٦
(٢) ہدایہ مع الفتح ١٣٣/٢
(٣) اسی پر فتویٰ ہے۔ ردالمحتار ٢٤/٢
(٤) حوالہ سابق
(٥) کتاب الخراج لابی یوسف ٨٠
(٦) دیکھیے بدائع ٤٣/٢ قرطبی ١٦٩/٨ الام ٨١/٢
(٧) بدائع ٤٤/٢
(٨) تاتارخانیہ ٢٦٨/٢

بھی یہی مسئلہ ہے۔(۱)

۴ - مقروض جن کو قرآن نے "غارمین" کہا ہے، یعنی ایک شخص صاحب نصاب ہو لیکن اس پر لوگوں کے اتنے قرض ہوں کہ ان کو ادا کرے تو صاحبِ نصاب باقی نہ رہے، ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے(۲) بلکہ عام فقراء کے مقابلہ ان کو زکوٰۃ دینے میں زیادہ اجر ہے۔(۳)

۵ - فی سبیل اللہ — حنفیہ کے یہاں اس سے خصوصیت کے ساتھ وہ اہل حاجت مراد ہیں جو جہاد، دینی تعلیم کے حصول، میں لگے ہوئے ہوں۔(۴)

۶ - مسافرین یعنی وہ لوگ جو اصلاً تو زکوٰۃ کے حقدار نہ ہوں لیکن سفر کی حالت میں ضرورت مند ہوگئے ہوں، یہ زکوٰۃ لے سکتے ہیں، مگر اتنا ہی لیں جتنے سے کام چل جائے۔(۵)

۲ - زکوٰۃ کی رقم صرف مسلمانوں ہی کو دی جائے گی، غیر مسلم کو نہیں۔(۶)

۳ - بنوہاشم و سادات کو (جن کی حاجت کسی اور مد سے پوری نہ ہو پائے) زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔(۷)

۴ - والدین، دادا، دادی، نانا، نانی اولاد اور ان کا سلسلہ اولاد، شوہر بیوی ان اقرباء میں شامل ہیں جنہیں زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔(۸)

۵ - جو شخص بنیادی ضروریات کے علاوہ زمین، کھیت، فاضل مکان، غیر استعمالی کپڑے وغیرہ اشیاء میں اتنی جائداد کا مالک ہو کہ اس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی پہنچ جاتی ہو تو اس کے لیے زکوٰۃ لینی جائز نہیں۔(۹)

۶ - محتاج اور مالدار ہونے میں نابالغ بچوں کا وہی درجہ ہوگا جو ان کے باپ کا ہے باپ کے لیے زکوٰۃ جائز ہو تو ان کے لیے بھی زکوٰۃ جائز ہوگی اور باپ کے لیے جائز نہ ہو تو ان کے لیے بھی زکوٰۃ جائز نہ ہوگی۔(۱۰)

---

(۱) قرطبی ۱۷۱/۸ — (۲) احکام القرآن للجصاص ۳۲/۳
(۳) تاتارخانیہ ۲۷۰/۲ — (۴) البحرالرائق ۲۴۲/۲ تاتارخانیہ ۲۷۰/۲
(۵) تاتارخانیہ ۲۷۱/۲ البحرالرائق ۲۴۲/۲ — (۶) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۸۳/۲
(۷) یہی امام ابوحنیفہ کا ایک قول ہے اور بہت سے علمانے اس کو اختیار کیا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے عبادات اور چند اہم جدید فقہی مسائل حصہ دوم ۱۳۵/
(۸) بدائع ۴۹/۲ تاتارخانیہ ۲۷۱/۲
(۹) بدائع ۴۸/۲ — (۱۰) البحرالرائق ۲۴۵/۲

۷ - بالغ لڑکوں کے فقیر و مالدار ہونے میں خود ان کا اعتبار ہے، باپ گو مالدار ہو لیکن لڑکے محتاج ہوں تو زکوٰۃ لے سکتے ہیں۔(۱)

۸ - محتاج علماء، علوم دینیہ کے طلبا اور دین دار محتاجوں کو زکوٰۃ دینے میں زیادہ ثواب ہے۔(۲)

۹ - اسی طرح ان اقرباء کو زکوٰۃ دینا (اگر وہ مستحق ہوں) زیادہ بہتر ہے جو زکوٰۃ لے سکتے ہیں، جیسے بھائی، بہن، چچا، پھوپھی، خالہ، ماموں اور چچازاد، خالہ زاد بھائی بہن وغیرہ۔(۳)

۱۰ - یہ بات بہتر ہے کہ اہل شہر کو زکوٰۃ دینے میں اولیت دی جائے، ہاں اگر دوسری جگہ زیادہ محتاج لوگ ہوں، دینی ادارے ہوں، اقرباء ہوں، تو دوسرے شہر کو زکوٰۃ بھیجنے میں کوئی قباحت نہیں بلکہ زیادہ بہتر ہے۔(۴)

۱۱ - زکوٰۃ کے جو مدات قرآن مجید نے متعین کیے ہیں اگر ان میں سے ایک یا بعض ہی پر پوری زکوٰۃ صرف کردیں تو کوئی حرج نہیں۔(۵)

۱۲ - بہتر ہے کہ زکوٰۃ اتنی مقدار میں دی جائے کہ ضرورت پوری ہو جائے، مقروض ہو تو قرض ادا ہو جائے، مسافر ہو تو منزل تک پہنچ جائے، فقراء کو امام ابوحنیفہ کے یہاں بہتر ہے کہ ایک مقدار نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت سے کم دے، مقدار نصاب سے زیادہ دے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی لیکن ایسا کرنا ان کے نزدیک مکروہ ہے۔(۶)

کثیر العیال شخص کو مقدار نصاب سے زیادہ زکوٰۃ دی جاسکتی ہے بشرطیکہ اس کے زیر پرورش لوگوں میں تقسیم کی جائے تو فی کس ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت سے کم ہر ایک کے حصہ میں آتی ہو کہ تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔(۷)

۱۳ - مردوں کی تجہیز و تکفین اور مسجدوں کی تعمیر میں زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی،(۸) پلوں کی تعمیر، سڑکوں کی مرمت اور اس طرح کی دوسری چیزوں میں بھی زکوٰۃ صرف نہیں کی جاسکتی۔(۹)

۱۴ - زکوٰۃ کی رقم کو قرض کے لین دین کے لیے محفوظ کرنا یا کاروبار میں لگانا اور اس کا

---

(۱) حوالہ سابق — (۲) ردالمحتار ۶۹/۲
(۳) ردالمحتار ۶۷/۲ — (۴) تاتارخانیہ ۲۸۲/۲
(۵) دیکھیے الجامع لاحکام القرآن ۱۶۷/۸ — (۶) دیکھیے المغنی ۳۸۲/۲ اور البحرالرائق ۲۳۹/۲
(۷) قرطبی ۱۹۱/۸ — (۸) ہدایہ مع الفتح ۲۰۷/۲
(۹) مجمع الانہر ۲۲۲/۱

نفع فقراء پر تقسیم کرنا درست نہیں اور اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔

۱۵ - ایسے ضروری دینی اور قومی کام جن پر زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی اس کا اگر کسی فقیر کو مالک بنادیا جائے اور وہ زکوٰۃ کی وہ رقم ایسے کاموں پر صرف کرے تو کوئی حرج نہیں۔(۱)

زکوٰۃ کا اجتماعی نظام

اسلام میں اس بات کو پسند کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی زکوٰۃ اجتماعی طور پر جمع ہو اور مستحقین میں تقسیم ہو خود قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے (توبہ-۱۳۰) اسی پر عہد صحابہ اور بعد کے زمانوں میں بھی عمل رہا،(۲) اس لیے:

۱ - جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو وہاں حکومت کو چاہیے کہ بیت المال قائم کرے، زکوٰۃ وصول کرے اور مدّات مقررہ پر صرف کرے۔(۳)

۲ - ہندوستان میں بھی مسلمانوں پر نظامِ امارت قائم کرنا واجب ہے۔(۴) جن صوبوں میں اس طرح کی امارت قائم ہوں وہاں کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ اسی امارت کے بیت المال میں جمع کریں۔(۵)

۳ - جہاں اس طرح کا نظام قائم نہ ہو، وہاں بھی مسلمانوں کو کوئی ایسی اجتماعی شکل پیدا کرنی چاہیے جو زکوٰۃ کی وصولی و تقسیم کا نظم سنبھالے۔

زکوٰۃ ادا کرنے کے آداب

۱ - کسی کو زکوٰۃ دینے کے بعد اس پر احسان نہ جتائے، نہ بے موقع اظہار یا طعن و تشنیع کے ذریعہ اس کو ایذا پہنچانے کا باعث بنے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس سے انفاق کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔(بقرہ-۲۶۷)

---

(۱) درمختار علی ہامش الرد ۱۶/۲ (۲) بدائع الصنائع ۳۵/۲

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے: المبسوط ۱۷/۳-۱۸ شامی ۵۷/۲

(۴) فتح القدیر ۳-۳۶۵

(۵) دیکھیے: کتاب العشر والزکوٰۃ باب ولایۃ اخذ العشر والزکوٰۃ ص: ۵۳-۱۳۴

۲ - زکوٰۃ ادا کرنے میں ریا اور نمائش نہ ہو چھپا کر دینا زیادہ بہتر ہے (بقرہ-۲۷۱) البتہ اگر کہیں اظہار سے ترغیب دینا مقصود ہو یا اور کوئی دینی مصلحت مقصود ہو تو اظہار میں بھی قباحت نہیں۔(۱)

۳ - زکوٰۃ و خیرات میں مال کا بہتر حصہ اللہ کی راہ میں دینا چاہیے۔(بقرہ-۲۶۷)

۴ - مال حلال ہونا چاہیے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ مال حرام میں صدقہ جائز نہیں،(۲) لیکن اگر حرام مال کے ساتھ اس طرح مل گیا کہ امتیاز وشناخت نہ رہے تو دونوں کے مجموعہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔(۳)

۵ - جس قدر بہتر مصرف کا انتخاب کیا جائے، اسی قدر اجر میں بھی اضافہ ہوگا، یہ بہترین مصرف ہے علماء اہل دین و تقویٰ خود دار غیرت مند، دینی مشغولیت کی وجہ سے کسبِ معاش سے معذور لوگ اور اقرباور شتہ دار۔(۴)

۞۞۞۞۞۞

---

(۱) احیاء العلوم مع الاتحاف ۸۸/۴ (۲) ترمذی ۳/۱

(۳) شامی ۲۸/۲ (۴) دیکھیے: احیاء العلوم مع الاتحاف ۲۰۹/۴-۲۱۶ ط